نوٹ:

اِس ناول کے تمام کردار فرضی ہیں
کسی قسم کی مطابقت محض ایک اتفاق سمجھا
جائے نیز تاریخی شخصیتوں کے ساتھ
منسوب کیے گئے جملے مصنف کے اپنے
تصور کی اختراع ہیں۔

—— آنند لہر

آنند لہر

اگلی عید سے پہلے

آنند لہر

کشمیر کتاب گھر
ریذیڈنسی روڈ، جموں

نام کتاب	:	اگلی عید سے پہلے۔
نام مصنف	:	آنند لہر۔
پتہ مصنف	:	پلاٹ نمبر ۱۹، بخشی نگر، جموں۔ ۱۸۰۰۰۱۔
بپیشہ	:	وکالت۔
اشاعت	:	۱۹۹۷ء
تعداد	:	دو ہزار دو سو۔
کتابت	:	جمال گیاوی
طباعت	:	لکشمی آفسیٹ پریس، دہلی۔
قیمت	:	ایک سو روپے۔

ناشر :
کشمیر کتاب گھر
ریذیڈنسی روڈ، جموں (توی)

اِنتساب

نام

کشمیر کی لڑائی میں
مرنے والے
اُن لوگوں کے

جنھیں سیکورٹی فورسز کے سپاہی
یا اُگروادی کہا گیا
حالانکہ
وہ بھی رشتوں، ناطوں، سلسلوں
اور تعلقات میں بندھے تھے
اور گھروں کے دروازے
اُن کے انتظار میں بھی کھلے تھے

— آنند لہر

اِس ناول کی بُنیاد ہے:
یہ نعرہ —

شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد
ہندو مسلم سکھ اِتحاد

دیباچہ

میرے عزیز دوست آنند لہر دنیائے ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ وہ صفِ اوّل کے افسانہ نگار، ناول نگار اور تمثیل نگار ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں لیکن ابھی تک بطور شاعر کے وہ منظرِ عام پر نہیں آئے منظرِ خاص تک ہی محدود ہیں۔ جہاں تک فکشن نگاری کا تعلق ہے ان کے افسانے ملک کے بلند پایہ ادبی جریدوں میں شائع ہو کر خواص و عوام سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ حال ہی میں ان کا ایک ڈرامہ "تپسوی کون" ہندوستان بھر میں شرفِ قبولیت کی بلند منزلوں تک پہنچ چکا ہے۔

آنند لہر صاحب کا زیرِ نظر ناول "اگلی عید سے پہلے" سرزمینِ کشمیر کی ایک دردبھری داستان ہے۔ جو مصنف نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھی ہے۔ یہ داستان ہندوستان

کی آزادی سے شروع ہو کر آج تک پہنچتی ہے یعنی سنہ ۱۹۴۷ء سے سنہ ۱۹۹۶ء تک۔ سرزمینِ کشمیر کی یہ دردبھری روداد جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے ایک ایسی روداد ہے جس میں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں کہیں کہیں تصادم بھی ہو جاتے ہیں اور نتیجتہً کہیں اندھیرا فتح یاب ہوتا ہے اور کہیں روشنی لیکن انجامِ کار روشنی ہی کامران و نصرت یاب ہوتی ہے جس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ نصف صدی کا یہ سارا سفر ناول نگار کے اپنے دل کی تجلی سے جگمگا رہا ہے۔ ناول نگار نہ قنوطی PASSIMIST ہے نہ رجائی OPTIMIST بلکہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ دنیا سعیِ انسانی کے ذریعے سے بہتر ہو سکتی ہے یعنی اصلاح کا قائل MELLIBRST ہے۔

بنی نوعِ انسان سے محبت اور بالخصوص سرزمینِ کشمیر سے محبت ناول نگار کے رگ و پے میں رچی بسی ہوئی ہے اور قاری کو یہ ناول کے شروع ہی میں نظر آ جاتی ہے۔ قبائلی کے چھرے سے مارا ہوا اگنتا قبائلیوں کے کپتان کے تصور میں زندہ ہو جاتا ہے اور پوچھ رہا ہے کہ مجھے کیوں مارا ہے۔ یہاں ناول نگار کا فن خاص طور سے قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے جب ایک قبائلی کہتا ہے "یہاں کے کتے بھی عجیب ہیں۔۔۔" دوسرا قبائلی جواب میں کہتا ہے۔ "یہاں کی ہر چیز عجیب ہے" اس پر تیسرا قبائلی یوں گویا ہوتا ہے۔ "یہاں کی ہوا بھی عجیب ہے لگتا ہے کہ انسانی پیار اس کے اندر بسا ہوا ہے۔" اس پر

کپتان اس مکالمے کو یوں ختم کرتا ہے " اور خدا کو ہم انسان سے
الگ نہیں کر سکتے"۔ گویا ناول نگار قدم بہ قدم فن کارانہ انداز سے
قاری کو اس تاریخی حقیقت کے قریب لا رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کہ یہی وہ
سرزمین ہے جہاں مہاتما گاندھی کو امید کی کرن نظر آئی تھی۔

آنند لہر ایک صاف ذہن کا مصنف ہے۔ (اور اگر ایک مصنف
صاف ذہن کا فرد نہیں ہے تو وہ مصنفوں کی صف میں بیٹھنے کے
قابل نہیں ہے۔) اس لیے اُس کی نگاہ میں نماز بھی محترم ہے اور پوجا
بھی۔ اس کے الفاظ میں بوڑھا قبائلی اپنے دل کی بات یوں زبان پر
لاتا ہے کہ "میرا تجربہ کہتا ہے کہ ہم عبداللہ سے نہیں اس کی نماز
سے ڈرتے ہیں۔ اُس کی سچائی سے ڈرتے ہیں۔" اور جب مندر سے
شنکھ چوری ہو جاتا ہے اور شانتی کہتی ہے کہ "شنکھ بدری
کا نہیں بلکہ مندر کا ہے۔ مندر اور مسجد اُس کشپ دیش کی اُس
دھرتی کی روایت ہیں۔" تو عبدل کہتا ہے کہ "یہ شنکھ ضرور
ڈھونڈ لیا جائے گا چاہے اس کے لیے مجھے اپنی جان ہی کیوں نہ دینا
پڑے۔" اس طرح کی تجلی پاشیاں ناول میں جگہ جگہ ملتی ہیں
اور ہر جگہ حسنِ بیان کے ساتھ۔ ایک آدھ اور مثال:

سلیمان اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔
اُس کے ماں باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے ۔ ۔ ۔ ۔
بچپن ہی سے وہ مندر میں پلا تھا۔ اُسے بدری
کے باپ نے پالا تھا۔ جب سلیمان بڑا ہوا تو اُسے
بدری کے باپ نے بتایا کہ وہ مسلمان ہے اور اُسے

نماز اور روزہ کی اہمیت بھی بتائی تھی۔
بدری ہی نے اُسے اسلام کے اصولوں پر
چلنے کا طریقہ بھی سمجھایا تھا اور یہ بھی بتایا
تھا کہ سچا مسلمان کیا ہوتا ہے"۔

اس ناول کی ایک نمایاں خوبی مصنف کا معروضی اندازِ بیان
ہے۔ موضوعی اندازِ بیان سے گریز مصنف کی دیانت پر دال ہے۔
معروضی اندازِ بیان کو آنند لہر نے کہیں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ خواہ
وہ کشمیر سے لوگوں کی ہجرتِ مکانی کا بیان ہو یا کسی فرد سے پولیس میں
بھرتی کے لیے دس ہزار کی رشوت طلب کی گئی ہو یا عمال حکومت کے
مظالم کا ذکر ہو۔ یہاں میں مقصدی ادب اور غیر مقصدی ادب کی
بحث نہیں چھیڑوں گا لیکن میں یہ کہے بغیر بھی آگے نہیں بڑھنا چاہتا
کہ اگر فن یا ادبیت مقصد پر حاوی رہے اور مقصد فن پر حاوی نہ
رہے بلکہ ایک موجِ زیریں کی طرح فن کا یا ادبیت کا جزو بنتا چلا جائے
تو وہ مقصدی ادب صحیح معنوں میں ایک فن پارہ بن جاتا ہے اور اُسے
"مقصدی ادب" کا الزام دے کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زیرِ نظر
ناول میں یہ خوبی اوّل سے آخر تک نظر آتی ہے کہ مقصد فن پر حاوی
ہونے کی بجائے فن میں ڈھلتا چلا جاتا ہے اور اس طرح ناصحانہ
یا پند آمیز مفہوم کو فن کا مرتبہ عطا کرتا چلا جاتا ہے۔
میں نے سطورِ بالا میں ناول کے ساختیاتی پہلو سے متعلق کچھ نہیں
لکھا اور واقعات؎۱ (EVENTS) کرداروں؎۲ CHARACTERS

؎۱ جو زمان و مکان کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں ؎۲ جن کی گفتگو ایکشن کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہے۔

مکالمے[1] DIALOGUE عمل یا فعل ACTION اور
اسلوب[2] کے بارے میں تفصیل سے بات چیت نہیں کی صرف اشاروں
سے کام لیا ہے۔ میں نے اس امر پر بھی کھل کر بحث نہیں کی کہ مصنف کا
نظریۂ حیات کیا ہے اور اس کا ناول کے ساتھ کیا رشتہ ہے پلاٹ
کے مربوط ہونے کا بھی میں نے ذکر نہیں کیا اور ان تمام امور سے قطع نظر
کرنے کا سبب یہ ہے کہ یہ تمام محاسن ناول کو اوّل سے آخر تک پڑھتے ہی
خود اپنے آپ کو نمایاں کرتے چلے جاتے ہیں اور اپنی اہمیت جتاتے چلے جاتے
ہیں۔ رہی خام مواد کی بات، تو وہ آنند لہر نے اپنے تصور سے نہیں لیا بلکہ
زندگی کے ان ٹھوس حقائق سے لیا ہے جو اس کی نظر کے سامنے تھے۔

عام طور سے فکشن کو فنونِ لطیفہ[3] کی فہرست میں شامل نہیں کیا
جاتا۔ ہاں ایک نمایاں تبدیلی جو اس فہرست میں ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ حال
ہی میں مشرقِ وسطیٰ کے دانش وروں نے رقص کو اس فہرست سے
خارج کر کے اس کی جگہ خطاطی کو شامل کر دیا ہے لیکن اس کے باوجود رقص،
صوفیانہ رقص کی صورت میں دُنیا کے اکثر حصوں میں موجود ہے۔ خیر یہ تو
ایک جملۂ معترضہ ہے۔ کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ میری ناقص رائے
میں فکشن کو بھی فنونِ لطیفہ کی فہرست میں شامل کیا جانا چاہیے۔ بعض
نقادوں میں ہنری جیمز اور ولیم ہنری ہڈسن خاص اہمیت کے حامل
ہیں، فکشن کو آرٹ کا مرتبہ دیا ہے لیکن ابھی تک عام طور سے فکشن

---

[1] جو خود زمان و مکان کے ساتھ وابستہ ہو کر واقعات (EVENTS) کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔
[2] جو واقعات، ایکشن اور کرداروں کے ساتھ مل کر تجزیے کو مکمل کرتا ہے۔
[3] شاعری، موسیقی، ڈراما، رقص، سنگ تراشی، مصوری اور تعمیر۔

کو آرٹ کی حدود سے باہر کیا جا رہا ہے مگر یہاں ایک بات کو پیشِ نظر
رکھنا ضروری ہے اور وہ یہ کہ جس طرح ہر نظم یا ہر غزل، ہر ڈرامے
یا مصوری کے ہر نمونے کو ہم آرٹ کا نمونہ قرار نہیں دیتے اور اس کے
لیے کڑے انتخاب کو لازم سمجھتے ہیں اسی طرح ہر افسانے یا ہر ناول
کو بھی ہم آرٹ کا نمونہ نہیں کہہ سکتے۔

میری نظر میں آنند لہر کا یہ ناول ایک فنکارانہ تخلیق
ہے۔ اور جب میں اسے فن کارانہ تخلیق کہتا ہوں تو مجھے اس میں جمالیات
کا پہلو بھی اپنی دلکشی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ
جمالیات وہ سستی جمالیات نہیں ہے جو غیر معتدل جنسی احساس یا
ترغیبِ جنسی (SEX) کی حدوں سے گزرتی ہوئی سوقیانہ ادب کی
تخلیق کا باعث بنتی ہے۔ یہ وہ نام نہاد جمالیات نہیں ہے جس کی
بیسیوں مثالیں نہیں، سینکڑوں مثالیں اردو شاعری اور اردو فکشن
میں موجود ہیں بلکہ یہ وہ جمالیاتی پہلو ہے جس کی مثالیں ہمیں تلسی داس،
رومی، پریم چند اور اقبال کی تخلیقات میں نظر آتی ہیں۔ یہ جمالیات
کی وہ ارفع منزل ہے جہاں حُسن محض ایک صفت نہیں بلکہ ایک زندۂ جاوید
تاثر کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور جو جسم کے بناؤ سنگار کی نہیں بلکہ روح
کی بالیدگی کا مظہر بن جاتا ہے اور اس کی تخلیق اس وقت ہوتی ہے
جب موضوع کے اندر پوشیدہ متعدد پہلو، انبساط، حسن، ولولہ اور دلگری
سب مل کر اس طرح ایک اکائی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ ایک دوسرے
سے الگ کر کے دیکھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہی اکائی زیرِ نظر ناول
"اگلی عید سے پہلے" کے حُسن و جمال کی ضامن ہے۔

ناول کے آخری الفاظ میں آنند لہر کا وہ سارا جذبہ سمٹ کر آگیا ہے جسے ہم عام لفظوں میں ہندو مسلم اتحاد کا ایک سیاسی قسم کا نام دے دیتے ہیں لیکن حقیقتاً اسے (MEETING OF MINDS) یا دلوں کی ہم آہنگی کا نام دینا چاہیے۔ ہم اپنی روزمرہ کی عملی زندگی پر غور سے نگاہ ڈالیں تو نظر آئے گا کہ ہم اگر ہندو ہیں تو ہمارے دوستوں میں مسلمانوں کی کمی نہیں اور اگر ہم مسلمان ہیں تو ہمارے حلقۂ احباب میں ہندو دوستوں کی کوئی کمی نہیں اور اس دوستی کی بنیاد کسی سیاسی مفاد کے پیشِ نظر نہیں رکھی گئی بلکہ یہ مزاجی ہم آہنگی کی بنا پر اس طرح نمودار ہوئی ہے جس طرح خود بخود پھول شاخ پر نمودار ہوتا ہے۔ اب یہی تصویر آنند لہر کے الفاظ میں دیکھیے:

"مگر بدری چلا گیا ہے۔" ایک شخص نے کہا۔
"گیا نہیں بلکہ بھاگ گیا ہے۔" دوسرے شخص نے کہا۔
"مگر ہم نے اُسے روکا کیوں نہیں؟" ہم بدری کے بنا مکمل نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے آباو اجداد مکمل تھے۔"
"مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے بدری کو جانے کیوں دیا؟"
"کیونکہ ہم سچے مسلمان نہیں رہے۔" عبدل نے کہا۔
"مگر سوال یہ ہے کہ بدری نے ہمارا بگاڑا کیا تھا۔"

چوتھے شخص نے کہا۔
"اُس کی پوجا ہماری نماز کو مضبوط کرتی تھی۔ اُس کے برت ہمارے روزوں کی شان تھے۔" دوسرے شخص نے عبدل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
لوگوں نے پھر کانا پھوسی کی۔
"آؤ بدری کو لے آئیں۔" عبدل نے کہا۔
"وہ بھی اگلی عید سے پہلے۔" لوگوں نے بلند آواز میں جواب دیا۔

کاش ہندوستان اور پاکستان کے لوگ اس ناول کو پڑھیں اور اس کی رُوح تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

—— جگن ناتھ آزاد
جموں یونی ورسٹی، جموں
۷ نومبر ۱۹۹۶ء

ہر طرف گولیاں چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لوگ سہمے ہوئے تھے مگر ایک نعرہ روشنی بن کر اندھیرے کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔

"شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔۔۔"

یہ نعرہ لگانے والا کوئی بہت بڑا دُکان دار، کارخانہ دار یا لیڈر نہیں بلکہ کُلچے بنانے والا عبدُل تھا۔ شاید اس علاقے کا ڈپٹی کمشنر جو کہ وہاں کا حکمران تھا حکومت کر کے اتنا خوش نہیں تھا جتنا کہ عبدُل کلچے بنا کر۔۔۔ سب کچھ دیکھ کر یہ خیال آتا کہ انسان چاہے تو ذرّہ حاصل کر کے بھی خوش ہو سکتا ہے اور نہ چاہے تو پہاڑ حاصل کر کے بھی نہیں۔

عبدُل کے کُلچوں کو لوگ بلا لحاظ مذہب و ملّت کھاتے۔ مندر کا پُجاری بدری بھی اُسی طریقے سے کھاتا جس طریقے سے گلاب دین اور پھر لوگوں کو جہاں اونچے محلوں نے ایک دوسرے سے جُدا کیا وہاں پران کلچوں نے انھیں جوڑا۔ یہ کلچے اتنے پرانے ہیں جتنی ڈل جھیل لگتا ہے۔ کشمیر کے رِشی نے یہاں آ کر سب سے پہلے کلچہ ہی کھایا تھا۔

دُنیا کی ہر تہذیب میں میٹھا پسند کیا جاتا ہے مگر کشپ رشی کی اس دھرتی پر لوگ نمکین چائے پیتے ہیں۔ یہاں پر نمک پسند کیا جاتا ہے شاید اس لیے کہ اچھے انسان کی یہ پہچان ہے کہ وہ نمک حرام نہیں ہوتا چونکہ نمک انسانی تہذیب کی پہچان بن گیا ہے اس لیے یہاں کی تہذیب اصلی انسانی تہذیب کی نمایندگی کرتی ہے۔

نمکین چائے اور کُلچے کھانے والا کتنا میٹھا نعرہ لگاتا:

"شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد ہندو مسلم سکھ اتحاد۔۔۔"

کبھی کبھی تو یہ بھی لگتا ہے کہ یہ جلوس عبدُل نہ نکال رہا ہو بلکہ یہاں کے کُلچے نکال رہے ہوں۔

قبائلی چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے پاس بندوقیں تھیں، ہتھیار تھے۔۔۔۔۔ مگر عبدُل کے پاس ایک ہی نعرہ تھا۔۔۔

"شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد ہندو مسلم سکھ اتحاد۔۔۔"

اس نعرے کے سہارے ایک کُلچے بنانے والا شخص ایک بہت بڑے حملے کا مقابلہ کر رہا تھا۔ نڈر، بے خوف، امن اور پیار کے اس نعرے سے ہتھیار کانپ رہے تھے۔ قبائلی گھبرا رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کاش کلچوں کے بجائے عبدُل کے پاس ہتھیار ہوتے۔

پھر بدری اس گاؤں کا پُجاری ہی نہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ گاؤں کی آتما تھا۔

ایک دن زور سے گولیاں چلنے لگیں۔ ہر طرف ڈر کا ماحول پیدا

ہوگیا۔ اُس دن بدری گھبرایا اور ڈر کر اس نے اپنے گھر کا دروازہ بند کرلیا۔ رونے لگا۔ اپنی جوان بیٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ جنگ ہو یا قحط، ہر انسان اپنی جوان بیٹی کی طرف ضرور دیکھتا ہے۔

گالی جہاں بھی دی جائے اور جہاں بھی دی جائے اُس کا شکار عورت ہی رہتی ہے۔

"اب کیا ہوگا۔" بدری نے کہا۔ "بھگوان ہی جانے۔" بدری کی بیوی شانتی نے سوالیہ لہجے میں باتیں کرتے ہوئے کہا۔

بدری اور اس کی بیوی باتیں کر ہی رہے تھے کہ عبدُل نے ان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ؟" اندر سے بدری کی بیوی کی آواز آئی۔

"اب آواز بھی نہیں پہچان رہی ہو بھابی۔"

"اچھا اچھا عبدُل بھیا۔" شانتی نے پھر کہا۔

"دروازہ بھی کھولوگی بھابی یا باتوں میں ہی وقت ضائع کروگی . . ."

شانتی نے دروازہ کھولا۔ اور عبدل اندر داخل ہوگیا اور کہنے لگا۔

"بھابی جب تک عبدُل زندہ ہے تمھیں گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی دروازہ بند کرنے کی ضرورت ہے۔"

"جاؤ ذرا عبدُل اور میرے لئے چائے لاؤ۔" بدری نے شانتی سے کہا۔ اور چائے لانے کے لئے شانتی بھاگی۔

عبدل اور بدری باتوں میں مشغول ہوگئے۔ اسی دوران سُلیمان بھی وہاں پر آگیا۔

"آؤ سلیمان آؤ۔ آجکل تو تمھارے درشن ہی نہیں ہوتے۔" بدری نے کہا۔

"کیا کروں بھائی، آج کل دن میں سونا پڑتا ہے اور رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔" سلیمان نے کہا۔

"وہ کیوں، ایسی کون سی مجبوری ہے" ——— بدری نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"رات بھر نہرو ٹیلی فون کرتا رہتا ہے مجھ سے صلاح و مشورہ کرتا ہے۔" تینوں ہنسنے لگے۔

"ایک بات کہوں عبدل۔" بدری نے پوچھا۔

"کہو۔" عبدُل نے جواب دیا۔

"۱۹۴۷ء تو بیت جائے گا مگر تم ہمیشہ یاد رہوگے۔"

"اس میں یاد رکھنے کی کون سی بات ہے۔ جس طرح پانی کا بہنا، ہَوا کا ٹھنڈک دینا، چاند کا چاندنی دینا، ایک عام بات ہے اسی طریقے سے پڑوسی کی حفاظت کرنا ایک عام بات ہے اور یہی اسلام ہے۔"

"سچ کہتے ہو عبدُل اگر انسانی تہذیب آج تک زندہ ہے تو اسی بل بوتے پر کہ ہر ایک یگ میں کسی نہ کسی نے ایک دوسرے کے لیے کچھ کیا ہے۔ مگر ایک بات سچی ہے۔" بدری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا۔" عبدل نے پوچھا۔

"قبائلی یہاں سے چلے جائیں گے۔" چلے نہیں جائیں گے بلکہ بھاگ

جائیں گے۔" سلیمان نے جواب دیا۔ "اتحاد کی لاٹھی ہائیڈروجن بم سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔" عبدل نے پھر اپنی بات دہرائی۔

"اچھا بھائی تم گپ شپ کرو، مجھے جانا ہے۔" سلیمان نے کہا، اور وہاں سے جانے لگا۔

"کہاں جانا ہے تمھیں؟" بدری نے پوچھا۔

"کوئی انتظار کر رہی ہوگی۔" عبدل نے طنزاً کہا۔

"نہیں بھائی یہ بات نہیں ہے۔" سلیمان نے کہا۔ "مجھے رات کو ٹیلی فون پر نہرو سے بات کرنی ہوتی ہے۔ شیخ کو مشورہ دینا ہوتا ہے۔"

"ہاں بھائی کشمیر کا ہر شخص اب گاندھی اور آزاد سے کم بات نہیں کرتا۔" عبدل نے کہا۔

سلیمان وہاں سے چلا گیا —— سلیمان ہمیشہ سفید شلوار قمیض پہنتا ہے اور جب سے کشمیر آزاد ہوا ہے مونچھوں کو اوپر رکھتا ہے۔ اس کے گھر میں ایک عجیب خوشی سی چھائی رہتی ہے۔ دن بھر اپنے کھیت میں کام کرتا ہے۔ پھر شام کو ہر شخص کے گھر جا کر اس کا حال چال پوچھتا ہے۔

وہ جب چلتا ہے تو لگتا ہے کہ ہوا بھی چل رہی ہے۔ ہوا کے چلنے کے ساتھ چنار کے درختوں کے پتے بھی ہلتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ پتے ہل نہ رہے ہوں بلکہ نعرہ لگا رہے ہوں ... "شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔"

محسوس یہ بھی ہوتا کہ شیخ سے پہلے بھی یہ نعرہ یہاں موجود تھا اور کشپ رشی نے یہاں آکر سب سے پہلے یہ نعرہ لگایا ... "شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد" بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ کشمیر کی بنیاد یہ نعرہ ہے۔

رات کا اندھیرا چھانے لگا ہے۔ کشمیر میں رات عجیب طریقے سے

ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ رات ہو نہ رہی ہو بلکہ کوئی شخص رات کو بھیج رہا ہو۔

کچھ لوگ مندر کے باہر آ گئے۔ ایک شخص نے دور سے آواز دی ... "عبدل جلدی آؤ، اندھیرا ہو گیا ہے۔" عبدل یہ آواز سنتے ہی بدری کے گھر سے باہر آ گیا۔ پھر وہ لوگوں کے آگے آگے چلنے لگا ... اور یہ نعرہ لگانے لگا ... "شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔"

اندھیرا کافی ہو گیا اور مزے کی بات تو یہ بھی ہے کہ اس اندھیرے میں کشمیر زیادہ ہی خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔ اور یہاں کی گلیوں کے کتے بھی عجیب طریقے سے بھونکتے ہیں۔ یہاں کے کتے جب بھونکتے ہیں تو لگتا ہے کچھ پوچھ رہے ہوں۔

"کہاں جانا ہے۔" قبائلیوں کو یہاں کے کتوں سے بھی ڈر لگ رہا تھا۔

"لگتا ہے یہاں کے کتے جیسے کسی نے پڑھائے ہوں۔" قبائلی کپتان نے بات کی۔

"عجیب بات تو یہ ہے کہ جوں ہی ہم کہیں پہ حملہ کرنے کی بات سوچتے ہیں یہ بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔" سپاہی نے کپتان کی بات کا جواب دیا۔

"سچ تو یہ ہے کہ کاٹتے بھی نہیں مگر پھر بھی ان سے ڈر لگتا ہے۔" ... تیسرے سپاہی نے کپتان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں کے اسکولوں میں جب تک شیروانی کے متعلق پڑھایا جاتا ہے ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔" سپاہی نے پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ شیروانی جو مرتے مر گیا، شہید ہو گیا۔ مگر اپنے اصولوں پر قائم رہا۔" دوسرے سپاہی نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔

"چلو بھائی سو جاؤ۔" کپتان نے ان سے کہا۔ وہ تمام سو گئے۔ اس کے بعد کتوں نے بھونکنا بند کر دیا۔ یوں لگا جیسے یہاں کے کتے دشمن

کی نیند بھی حرام کرتے ہیں۔

صبح نمودار ہونے لگی۔ صبح بھی کیا ہے اس راز کو کوئی جان نہیں سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو حصہ اس کا سورج کے سامنے آتا ہے وہاں پر روشنی ہو جاتی ہے مگر یہ بات اتنی آسان نہیں کہ لفظوں میں آ سکے۔ لگتا ہے کہیں سچ اور کبھی اس کے ساتھ ہے۔ ... کہیں نہ کہیں زندگی بھی جڑی ہوئی ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کی پکڑ سے باہر ہے جو خیالوں سے اوپر ہے سوچ جہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔

سورج نکلنے والا ہی تھا کہ بدری نے شنکھ بجا کر اس کا سواگت کیا۔ ہر چیز خاموش ہو گئی۔

"اسلم" عبدل نے اپنے بڑے بیٹے کو آواز دی۔

"بولیے ابا" اسلم نے جواب دیا۔

"سنا نہیں بدری شنکھ بجا رہا ہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"

"سن رہا ہوں صرف شنکھ ہی نہیں بلکہ بدری چچا نے مندر کے اندر گھنٹیاں بجانی بھی شروع کر دی ہیں۔"

اسلم اٹھا اور نماز پڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔ ادھر مسجد سے آواز آئی "اللہ اکبر" پھر مندر کے اندر شنکھ بجا۔ لگا کہ شنکھ اذاں کی تائید کر رہا ہے۔ گویا کہہ رہا ہو یہی سچ ہے اور اللہ ہی اکبر ہے۔ پھر مسجد سے آواز آئی "اللہ اکبر" پھر مندر کے اندر شنکھ بجا گویا کہہ رہا ہو میں نے کب اس سے انکار کیا۔

محسوس ہوتا ہے کہ ساری دنیا کا مرکز سورج ہے اور چاند سورج سے روشنی لیتا نہیں بلکہ دھرتی کو روشن کرنے کے لیے چڑھ آتا ہے۔

دنیا کا ہر مذہب چاند کو ہی مرکز مانتا ہے۔ عید تب ہوتی ہے جب چاند نکلتا ہے۔ امرناتھ میں شولنگ کے درشن ہوتے ہیں جب پورن ماشی ہوتی ہے۔ مہاتما بدھ کو گیان تب حاصل ہوا جب چاند پورے جوبن پر تھا ... گورو نانک دیو جی کے جنم کے ساتھ بھی چاند کا ہی تعلق ہے۔

اگر چاند یعنی کہ روشنی سے شروع کریں تو ہر مذہب کی بنیاد ایک ہی ہے۔

پھر سورج نکلتے ہی زندگی شروع ہو گئی .... بچے رنگ برنگی وردیاں پہن کر اسکول جانے لگے۔ کھیتوں میں کام کرنے کے لیے دہقان تیار ہونے لگے اور عبدل پھر لوگوں کا جلوس لے کر آگے بڑھنے لگا اور نعرہ لگانے لگا: "شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔"

لگتا تھا کہ یہ عبدل کا جلوس نہ ہو بلکہ انسانیت کا کارواں ہو مگر وہ جو انسان کو لڑانا چاہتے ہیں، انھیں یہ کب برداشت ہو سکتا تھا، انسان کی بدقسمتی یہی ہے کہ جس آگ کو اس نے گرمی کے لیے پیدا کیا ہے اسی سے بعد میں اس نے اپنے گھروں کو جلایا۔ مذہب جو انسانی بھائی چارہ نمودار کرنے کے لئے ظہور میں آئے انسان نے انہی کے نام پر فساد کئے جنگیں کیں۔

زندگی میں سب سے قیمتی چیز زندگی ہی ہے ... کاش کہ انسان یہ سمجھ جائے۔

قبائلی جب ہر طرح سے پریشان ہوئے تو انھوں نے لوگوں کو آپس میں لڑانے کا منصوبہ بنایا۔ انھیں سب سے زیادہ آسان طریقہ یہ نظر آیا کہ لوگوں کو مذہب کے نام پر لڑایا جائے۔ بس اسی مقصد کے لیے گاؤں میں اشتہار پھینکنے لگے۔ ایک لڑکے نے اشتہار اٹھایا اور عبدل کے پاس چلا گیا۔

عبدل نے وہ اشتہار پڑھا اور پھر اس لڑکے سے کہا :

"جاؤ ذرا باقی لڑکوں کو بھی بلا کر لاؤ۔"

اتنی دیر میں وہ لڑکا باقی گاؤں کے لڑکوں کو بھی بلا کر لے آیا۔ گاؤں کے تمام لڑکے عبدل کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

"قبائلی اب ذلیل حرکتوں پر اتر آئے ہیں" عبدل نے کہا اور لڑکے اس کی طرف حیرانگی سے دیکھنے لگے ... "اور اس کا ثبوت یہ اشتہار ہیں۔" عبدل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"مگر ان میں لکھا کیا ہے۔" ایک ادھیڑ عمر کے شخص نے عجیب نظروں سے دیکھا اور عبدل سے سوال کیا۔ تمام لڑکوں نے اُن اشتہاروں کو پڑھنا شروع کر دیا۔

"یا ہر ہندو مسلمانوں کو مار رہے ہیں ..." ان اشتہاروں میں یہ لکھا ہے۔" عبدل نے پھر کہا۔

چاروں طرف ایک خاموشی سی چھا گئی۔ سردی کا موسم تھا مگر عبدل پسینے سے شرابور تھا۔ عبدل نے دیکھا کہ حاجی لوگ مدینے کی طرف جا رہے ہیں۔ عبدل نے لڑکوں سے متوجہ ہو کر کہا :

"اتنا خیال رکھنا صرف اتنا کہ یہ لوگ جب کعبے کی طرف جائیں تو ان کی نظریں نیچی نہ ہوں۔"

اتنے میں سلیمان نے وہاں آ کر اُن لوگوں سے اشتہار چھین لیے۔

"سلیمان یہ کیا کر رہے ہو۔" ایک شخص نے پوچھا :

"تمھیں معلوم نہیں کہ یہ اشتہار کتنے قیمتی ہیں۔" ________ "تم کیا کرو گے انھیں ..." ادھیڑ عمر کے شخص نے سلیمان سے پوچھا۔

"یہ اشتہار نسوار ڈالنے کے کام آئیں گے۔" ہجوم عبدل کی بات سن کر وہاں سے چلا گیا اور عبدل بھی چلا گیا۔ آہستہ آہستہ اندھیرا چھا گیا۔

نہ جانے رات کا مقدر کالا کیوں ہے۔ صرف رات کا مقدر کیوں لگتا ہے ساری کائنات کالی ہے۔ زمین کالی ہے۔ سورج تو زمین کو روشنی دیتا ہے مگر اصل میں زمین تو سیاہ ہے۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ سورج دھرتی کو روشنی دیتا نہیں بلکہ غصے میں پھینکتا ہے اور دھرتی یہ سب کچھ برداشت کرتی ہے ... اور برداشت کرنا اس کی مجبوری ہے۔

قبائلیوں نے ایک جگہ چھپ کر بیٹھ کر مشورہ کرنا شروع کر دیا: "تو ہمارا یہ ہتھیار بھی کامیاب نہیں ہوا۔" ایک نے دوسرے سے کہا۔

"مصیبت تو یہ ہے کہ یہ لوگ صرف نماز پڑھتے ہی نہیں بلکہ اس پر عمل بھی کرتے ہیں۔" دوسرے نے کہا۔ "پھر کون سے طریقہ اپنائیں" کیپٹن نے پوچھا۔

"ایسا ہے کہ کوئی ایسا طریقہ تلاش کیا جائے جس سے یہ لوگ نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔" دوسرے قبائلی نے شراب کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"مگر وہ نہیں ہو سکتا۔" دوسرے قبائلی نے پھر کہا۔ "مگر کیوں" کیپٹن نے پھر اپنی بات دہرائی۔

"جب تک بدری اس گاؤں میں ہے یہ لوگ نماز پڑھنا نہیں چھوڑ سکتے۔" قبائلی نے معقول جواب دیا اور وہ تمام لوگ ایک گہری سوچ میں پڑ گئے۔ اتنی دیر میں ایک کتا وہاں پر آیا اور جیسے کہ انھیں دیکھنے لگا گویا کہ انھیں کہہ رہا ہو کہ تم اس قابل نہیں ہو کہ تم پہ بھونکا جائے۔ پھر ایک قبائلی نے اٹھ کر اس کے پیٹ میں چھرا مار دیا۔ پھر دوسرے نے اس کے منہ پر اپنا جوتا مارا اور کتا وہیں پر مر گیا۔

کتے کو مرتا دیکھ کر وہ سب شرمندہ ہو گئے۔ جب انسان خود کو گراتا ہے تو اس کی زندگی کتے کی موت سے بھی بدتر ہو جاتی ہے ... کیپٹن کتے کو

کو یوں دیکھنے لگا جیسے اُس سے کہہ رہا ہو . . . ’میں ان میں شامل نہیں ہوں . . .‘ دور سے ایک اور کتے کے بھونکنے کی آواز آئی . . . گویا کہہ رہا ہو کہ اس گناہ میں ہر شخص شامل ہے۔

کیپٹن نے کتے کی لاش کی طرف دیکھا اُسے لگا کہ کتا زندہ ہو گیا ہو پھر اُس نے محسوس کیا کہ کتا مرا ہی نہیں بلکہ زندہ ہے اور پوچھ رہا ہے: ’میرا قصور کیا ہے؟‘

کیپٹن نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے سپاہی سے پوچھا:

”کیوں مارا ہے اسے؟“

”یہاں کے کتے بھی عجیب ہیں۔“ قبائلی نے کہا . . . ”کتے ہی کیوں یہاں کی ہر چیز عجیب ہے،“ دوسرے قبائلی نے جواب دیا۔

”یہاں کی ہوا بھی عجیب ہے لگتا ہے کہ انسانی پیار اس کے اندر بسا ہوا ہے۔“ تیسرے قبائلی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”اور ہوا کو ہم الگ نہیں کر سکتے۔“ کیپٹن نے فخریہ لہجے میں ہی بات کی۔

اور اتنے میں ایک قبائلی وہاں پر آ گیا اور آتے ہی اُس نے کیپٹن سے کہا:

”کیپٹن تمھیں معلوم ہے ہم یہاں کیوں کامیاب نہیں ہو سکتے۔“

”تم ہی بتاؤ۔“ کیپٹن نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔

”ایک نعرہ ہمیں کامیاب نہیں ہونے دیتا۔“

”وہ کیا؟“ کیپٹن نے پوچھا۔

”وہ نعرہ ہے ’شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد‘“ قبائلی نے جواب دیا۔

”یہ بالکل سچ ہے۔“ کیپٹن نے کہا . . . ”اسی نعرے نے تو جناح کو بھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اور اس نعرے میں گاندھی کو روشنی

کی کرن نظر آئی تھی۔“

”اتحاد میں بڑی طاقت ہے بھائی . . .“ دوسرے قبائلی نے پھر کہا۔

”مگر یہاں کے لوگ مذہب کے نام پر لڑتے کیوں نہیں؟“ پہلے قبائلی نے پوچھا:

”یہ بات کسی سے کہنا نہیں۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ یہ لوگ مذہب کو سمجھتے ہیں۔“ کیپٹن نے ڈرتے ڈرتے بات کی۔

”ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔“ دوسرے قبائلی نے مشورہ دیتے ہوئے کہا:

”وہ کیا؟“ کیپٹن نے پوچھا۔

”پجاری کا شنکھ چرا لیا جائے۔ کیوں کہ ایسا کرنے سے نہ پجاری شنکھ بجائے گا اور نہ ہی لوگ نماز پڑھیں گے۔“

”یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔“ کیپٹن نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ یوں محسوس ہوا جیسے زمین اُسے گھور رہی ہو اور وہ زمین سے نظریں نہ ملا سکتا ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی جب بھی غلط کام کرتا ہے تو اس وقت آسمان کی طرف دیکھتا ہے کیوں کہ زمین سے نظریں ملانے کی ہمت اس میں نہیں ہوتی۔

”سنو وہ ٹھیک ہے اور جب سب لوگ سوئے ہوئے ہوں گے تو پھر غلام یہ کام کرے گا۔“

”ٹھیک ہے میں یہ کام کروں گا . . .“ غلام نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

رات ہو گئی . . . اور گاؤں میں ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کشمیر میں یوں لگتا ہے جیسے رات جلد ختم ہو جانا چاہتی ہو۔ بلکہ یوں کہا

جائے کہ رات خودکشی کرنا چاہتی ہے اس لیے نہیں کہ اسے دن سے پیار ہو گیا ہے بلکہ اس لیے کہ پدری کا شنکھ سننا چاہتی ہے اور مُلا کی اذان سننا چاہتی ہے۔ کیونکہ دن اور رات مل کر بھی کشب رشی کے مذہب کے بارے میں فیصلہ نہ کر سکے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مؤرخ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کشب رشی نے یہاں آکر شنکھ بھی بجایا اور نماز بھی پڑھی۔ حج پر بھی گیا اور امرناتھ کی گپھا کی یاترا بھی کی۔

غلام آگے بڑھا۔ پھر اس نے آہستہ سے مندر کا دروازہ کھولا۔ اُسے کپکپی ہونے لگی، تھر تھر کانپنے لگا۔ اُس نے دل میں سوچا مندر کی بے حرمتی کرو یا مسجد کی، کپکپی ایک ہی طرح سے ہوتی ہے۔ اُس نے محسوس کیا کہ گناہ ہندو کرے یا مسلمان، وہ گھبراتا ایک ہی طریقے سے ہے۔ پاپ جس ملک میں کیا جائے انسان کی روح ایک ہی طریقے سے کانپتی ہے۔

غلام آہستہ سے مندر کے دروازے کے اندر گیا۔ اس کی یہ حرکت اس کی آنکھوں نے پسند نہ کی اس کے اپنے ہی کانوں نے اس کے پاؤں کی آہٹ کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر اُس نے شنکھ چُرا لیا۔ پھر دروازہ بند کر کے باہر آ گیا۔ دوسرے کمرے کے اندر اُس نے دیکھا کہ پدری کی لڑکی کانتا جو انتہائی خوبصورت ہے بڑے اطمینان سے سو رہی ہے۔ کیونکہ اُس کے اوپر سایہ ہے اس نعرے کا "شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مُسلم سکھ اتحاد۔"

غلام نے سوچا کہ اس کے اور اس کے ملک کے خیالات میں کس قدر یکسانیت ہے۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے کشمیر کی بیٹی کانتا کو دیکھ رہا ہے اور اس کا ملک کشمیر کو۔ پھر اندھیرے میں بھاگتا ہوا غلام سیدھا کیپٹن کے پاس چلا گیا اور کہنے لگا:

"یہ لیجیے حضور شنکھ لے آیا ہوں۔"

قبائلی حیرانگی سے اُس شنکھ کو دیکھنے لگے اور سناٹا چھا گیا۔ اُن کے پاس بہترین اور جدید قسم کے ہتھیار تھے۔ وہ خونخوار بھی تھے اور

ظالم بھی۔ مگر نہ جانے کیوں انھیں اس شنکھ سے ڈر لگنے لگا۔

کیپٹن نے سناٹا توڑتے ہوئے کہا۔ "لگتا ہے اس لڑائی کو اب ہم جیت جائیں گے۔"

"حضور یہی شنکھ ان کا محافظ تھا... بڑا ناز کرتے تھے اس پر۔"

"لیکن ہمیں یہاں سے جلدی کہیں دُور چلے جانا چاہیے۔" کیپٹن نے کہا۔

"مگر کیوں؟"
دوسرے قبائلی نے پوچھا۔

"اس لئے کہ کہیں عبدل یہاں نہ پہنچ جائے۔" کیپٹن نے کہا۔

"مگر ہم عبدل سے ڈرتے کیوں ہیں؟" تیسرے قبائیلی نے پُوچھا۔

"یہی تو میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کوئی جرنیل نہیں ہے۔ نہ کوئی فوج ہے اس کے پاس، اور نہ ہی اس نے انسانوں کو مارنے کی ٹریننگ لی ہے۔" کیپٹن نے جواب دیا۔

"میں عبدل سے زیادہ اُس کے نعرے سے ڈرتا ہوں . . ." تیسرے قبائلی نے کہا۔

"میں دوسری بڑی جنگ بڑی بڑی فوجوں کو شکست دینے والی فوجوں میں شامل تھا مگر میں اُن سے کبھی نہیں ڈرا جتنا کہ میں عبدل سے ڈرتا ہوں . . ." کیپٹن نے کہا۔ . . "پھر عبدل ہے بھی کیا سُوکھا ہوا جسم، تپلے تپلے ہاتھ۔"

"میں نے اُس کا گھر بھی دیکھا ہے۔ بس ایک جھونپڑا اور تھوڑا سا سامان۔" دوسرے قبائلی نے اُس کی بات کا جواب دیا۔

"میرا تجربہ کہتا ہے کہ ہم عبدل سے نہیں بلکہ اُس کی نماز سے ڈرتے ہیں اُس کی سچائی سے ڈرتے ہیں۔" ایک بوڑھے قبائلی نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اِدھر صبح جوں ہی بدری اُٹھا، اُس نے مندر کا دروازہ کھولا، مگر حیران ہو گیا کہ اُس کا شنکھ چوری ہو گیا ہے، اُسے لگا کہ شنکھ نہیں بلکہ وہ خود چوری ہو گیا ہے۔ کوئی اُسے اُس سے چھین کر لے گیا ہے۔ بدری نے کوئی احتجاج نہیں کیا چُپ چاپ اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

ہوائیں تیز ہو گئیں، درختوں کو ہلانے لگیں۔ چنار کے درختوں کے پتّوں کو ہوائیں گرانے لگیں۔ لگا کہ قدرت شرمندہ ہے اور اس بات کا احتجاج کر رہی ہے کہ بدری کیوں احتجاج نہیں کر رہا۔

دُھوپ نکل آئی۔ اسلم ابھی سویا ہوا تھا اور عبدل نے بھی نماز نہیں پڑھی تھی۔

"اسلم بیٹا، اسلم بیٹا۔" عبدل نے کہا۔

"کہیے ابّا جی!"

"باہر دُھوپ نکل آئی اور ہمیں معلوم ہی نہیں ہو سکا۔"

"لگتا ہے بدری چچا آج شنکھ بجانا بھول گیا۔" اسلم نے کہا۔

"ناممکن، ناممکن۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" عبدل نے کہا۔ "بدری اگر مر بھی جائے تو بھی شنکھ ضرور بجے گا۔ یہ شنکھ اُس کے بیٹے بجائیں گے۔ بھتیجے بجائیں گے۔ صدیوں سے یہ شنکھ بج رہا ہے، یگوں سے بج رہا ہے پھر آج یہ شنکھ کیوں نہیں بجا" ——— عبدل نے کہا۔

"یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے کہ آج یہ شنکھ کیوں نہیں بجا۔" اسلم نے کہا ——— "صدیوں سے بجنے والا یہ شنکھ آج خاموش کیسے ہو گیا!"

"لگتا ہے کہ کشمیر کی ساری تہذیب خاموش ہو گئی ہے۔" عبدل نے کہا اور مندر کی طرف چل پڑا۔

عبدل نے دیکھا کہ بدری فرش پر سویا ہے۔ سارے گھر میں ماتم چھایا ہوا ہے۔ چائے تک کسی نے نہ پی ہے۔ برتن بکھرے پڑے ہیں۔ عبدل نے بدری کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

"اُٹھو بدری اُٹھو۔ میں آ گیا ہوں، تمھارا عبدل آ گیا ہے۔" مگر بدری پر اس بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔

"بھابھی بدری کو ہوا کیا؟ بدری بولتا کیوں نہیں ہے؟" عبدل نے بدری کی بیوی شانتی سے پوچھا۔

"رات کو قبائلی آئے اور مندر کا دروازہ توڑ کر اُن کا شنکھ چرا کر لے گئے۔" شانتی نے روتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر بھابھی تم نے ہمیں جگایا کیوں نہیں؟" عبدل نے کہا۔

"جگاتے کیسے ہمیں تو خود بھی معلوم نہیں ہو سکا۔" شانتی بولی۔ "شنکھ بدری کا نہیں بلکہ مندر کا ہے۔ مندر اور مسجد کشیپ رِشی کی اس دھرتی کی وراثت ہیں۔" عبدل نے کہا ——— "یہ شنکھ ضرور ڈھونڈ لیا جائے گا۔ چاہے مجھے اس کے لئے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔"

عبدل نے اپنی بات دُہرائی۔

عبدل گاؤں کے گھر گھر گھوما اور پھر اس نے لوگوں کو اکٹھا کیا اور اعلان کیا:
"کوئی بھی شخص آرام سے نہ بیٹھے جب تک کہ شنکھ نہ ملے۔"

گاؤں اس طرح پریشان لگنے لگا جیسے اس کے موسم اس سے چھین لئے گئے ہوں۔ محسوس یوں ہوا جیسے پھولوں کو کھلنے سے کسی نے روکا ہو۔ ہر شخص پریشانی کے عالم میں تھا۔ کوئی مرا نہیں تھا، اس گاؤں میں نہ ہی کوئی بہت بڑا حادثہ ہوا تھا۔ عام لوگوں کے لئے شنکھ کا گم ہو جانا شاید معمولی بات تھی مگر اس گاؤں کے لوگوں کے لئے جیسے گاؤں کو ہی کوئی چرا کر لے گیا ہو۔

مرد، عورتیں، بچے بدری کے پاس جانے سے کتراتے تھے جیسے ان میں سے ہر شخص ملزم ہو اور اپنے آپ کو یہ کہہ کر کوس رہا ہو... "تم نے بدری کے شنکھ کی حفاظت کیوں نہیں کی؟"

"مگر قبائلیوں نے یہ شنکھ چرایا کیوں...؟" ایک شخص نے عبدل سے پوچھا۔

"صرف اس لئے کہ بدری اسے بجا نہ سکے۔" دوسرے شخص نے جلدی میں جواب دینے کی کوشش کی۔

"صرف اس لئے ہی نہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ہم لوگ نماز نہ پڑھ سکیں۔" عبدل نے جواب دیا۔

"تو قبائلی پوجا کے بھی اتنے ہی دشمن ہیں جتنے نماز کے۔" ایک شخص نے کہا۔

"پوجا کا دشمن ہونے سے پہلے نماز کا دشمن ہونا لازمی ہے۔" عبدل نے پھر اپنی بات جاری رکھی... "یعنی ایسا اس لیے ہوا کیونکہ شنکھ بجنے کے ساتھ ہی یہاں پر نماز بھی شروع ہوتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" دوسرے شخص نے کہا۔ "یہ حملہ اصل میں

صرف شنکھ پر ہی نہیں بلکہ نماز پر بھی ہے۔ اصل میں کشمیر پر ہونے والا ہر حملہ نماز پر ہے اور نماز پر ہونے والا حملہ پوجا پر ہے۔"

لوگ آپس میں صلاح و مشورہ کر رہے تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ تدبیریں سوچ رہے تھے کہ اتنے میں کچھ فوجی وہاں پر آئے۔ ایک افسر نے ان سے مخاطب ہو کر پوچھا:

"کیا ہوا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" عبدل نے جواب دیا۔ "مگر ہم آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟" افسر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ صاحب!" عبدل نے پھر کہا۔ "اصل میں یہاں مندر کا شنکھ چوری ہو گیا ہے۔"

"ہم برآمد کروا دیتے ہیں۔" افسر نے کہا۔

"نہیں حضور یہ ہم خود ہی تلاش کر لیں گے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہماری حفاظت کے لئے آئے ہیں۔" عبدل نے پھر کہا۔

"اسی لئے ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔" فوجی افسر نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں صاحب، فوج ہمیشہ بارڈر پر ہی اچھی لگتی ہے۔ یہ کام ہمارا ہے۔ ہم خود ہی کریں گے۔" عبدل کی بات سن کر فوجی وہاں سے چلے گئے۔

ادھر کافی تلاش کرنے پر بھی وہ شنکھ نہیں ملا۔ گاؤں کا کونہ کونہ لوگوں نے چھان مارا۔

بدری نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ وہ دن بھر سویا رہتا اور رات کو گاؤں کی گلیوں میں گھومتا رہتا۔ چیختا چلاتا۔ گاؤں کے کتے بھی رات کو عجیب طریقے سے بھونکتے۔ سارا گاؤں سنسان نظر آتا تھا۔ شنکھ کیا گم ہو گیا لگتا تھا جیسے گاؤں کے جذبے گم ہو گئے ہوں۔ لگتا تھا کہ کشمیر

کے سینے پر ایک زخم پیدا ہو گیا ہو ——— وقت بیت رہا تھا مگر ایسا لگ رہا تھا کہ لوگ بیت رہے ہیں۔

بدری کے آنسو بھی سوکھ گئے تھے۔ اب تو وہ رو بھی نہیں سکتا تھا۔ دن بھر چُپ چاپ بیٹھا رہتا۔

ایک دن صبح سلیمان اُٹھا اور سیدھا بدری کے گھر چلا گیا۔ بدری کی یہ حالت دیکھ کر سلیمان سے رہا نہ گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور وہ آنسو کیسے آ گئے یہ بات سلیمان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ سلیمان رو نہیں رہا تھا۔ اور سلیمان کبھی آج تک رویا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُس وقت بھی نہیں آئے تھے جب اُس کا بھائی آزادی کی تحریک میں مارا گیا تھا۔ جب اُس کا چچا "کشمیر چھوڑ دو" کی تحریک میں شہید ہو گیا تھا۔

"بدری برداشت کا مادّہ پیدا کرو۔" سلیمان نے کہا۔ "تمھارا غم سارے گاؤں کا غم ہے۔"

"یہی تو ایک سہارا ہے اور اسی کے سہارے جی رہا ہوں۔" بدری نے کہا۔

"کھانا کھاؤ بدری۔" سلیمان نے کہا۔

"نہیں بھائی دِل نہیں کرتا۔" بدری نے جواب دیا۔

"اچھا اگر تم نہیں کھاؤ گے تو میں بھی نہیں کھاؤں گا ——— اور پھر نہرو بھی بھوکا رہے گا۔ کیونکہ سب کو معلوم ہے کہ میں اور نہرو ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔" سلیمان نے روندھی آواز میں کہا۔

اتنے میں بدری کی لڑکی کانتا وہاں پر آئی اور اُس نے کہا۔

"ماں کی حالت زیادہ خراب ہو گئی ہے" ——— "تم اسے کسی طریقے سے کھانا کھلاؤ۔"

بدری نے کانتا سے کہا "کیا کروں ماں کسی بھی طریقے سے نہیں مانتی۔" اندر سے کراہنے کی آوازیں آنے لگیں۔ بدری اور عبدل کمرے کے اندر آ گئے اور انھوں نے دیکھا کہ شانتی بے سُدھ ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی ہے۔

لگتا تھا کہ شانتی نہیں بلکہ کشمیر کی تہذیب زخمی حالت میں پڑی ہوئی تھی کیونکہ اُس کا شنکھ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کی نماز پریشان ہو گئی تھی۔

شانتی کا بدن پیلا پڑ گیا تھا۔ اُس کی آنکھیں ظاہر کر رہی تھیں کہ ڈل میں پانی ضرور ہے مگر پانی کی آتما غائب ہو گئی ہے۔ اصل میں کشمیر کا پانی صرف پانی ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ یہ حاجیوں کے خوشی کے وہ آنسو ہیں جو وہ حج کرتے وقت جاتے ہوئے بہاتے ہیں۔

"آہ وہ شنکھ۔" شانتی نے اتنا کہا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

"کوئی بات نہیں بہن اگر شنکھ آج نہیں تو کل ضرور مل جائے گا۔" سلیمان نے کہا مگر شانتی کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سلیمان گھبرا گیا اور اُس نے کہا ——— "میں جا کر حکیم کو بُلا کر لاتا ہوں۔" سلیمان گیا اور حکیم کو بُلا کر لے آیا۔ حکیم نے آتے ہی شانتی کی نبض دیکھی مگر چُپ رہا۔ پھر کچھ سوچنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" سلیمان نے پوچھا۔۔ "کوئی خطرہ تو نہیں؟"

"خطرے کی کوئی بات نہیں۔" حکیم نے جواب دیا۔ "مگر بیماری لاعلاج ہے۔" حکیم نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔

"مگر بہن شانتی کو بیماری ہے کیا؟" سلیمان نے پوچھا۔

"شانتی کی بیماری سب جانتے ہیں۔" حکیم نے کہا۔

"اور وہ بیماری ہے شنکھ۔" سلیمان نے جواب دیا۔

"ہاں بھائی ہر بیماری کا علاج ہے مگر دل کی بیماری کا کوئی علاج نہیں۔" حکیم نے کہا۔۔ "ویسے کچھ دوائیاں میں ابھی تیار کرتا ہوں کسی کو بھیج کر منگوا لینا۔"

"شانتی کو ایک دوسرا غم بھی ہے۔" بدری نے کہا۔

"وہ کیا؟" سلیمان نے پوچھا۔

"یہی کہ جب سے میں نے شنکھ بجانا چھوڑ دیا ہے تم لوگوں نے بھی نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے۔" بدری نے کہا اور پھر پرانے بستر پر لیٹ گیا لگا کہ بے ہوش ہو گیا ہے۔ سلیمان نے چاروں طرف دیکھا اُسے لگا کہ ہر چیز اس کو گھور رہی ہے۔

پھر اس نے زور سے اپنے آپ کو یوں مخاطب کیا:

"کشمیری مسلمان صرف مسلمان کہلاتا نہیں بلکہ اسلام کے اصولوں پر بھی چلتا ہے جب تک بدری شنکھ نہیں بجاتا میں بھی نماز نہیں پڑھ سکتا۔"

دور بستی میں چڑیوں کے چہچہانے کی آواز آئی۔ سلیمان کو لگا کہ پرندے بھی اُس کی تائید کر رہے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ سلیمان ہی سچا مسلمان ہے۔ پھر پرندے اور چہچہائے۔ عبدل کو لگا کہ جن لوگوں نے یہ بدری کا شنکھ چرایا۔ ان کو اپنے آپ کو مسلمان کہنے پر پرندے احتجاج کر رہے ہیں۔ سلیمان باہر آ گیا اور آوارہ بادل کی طرح چلنے لگا۔

گاؤں والے شنکھ تلاش کرنے کی مختلف تدبیریں سوچ رہے تھے۔ پریشان تھے۔ دن کو شنکھ تلاش کرتے اور رات کو ایک بہت بڑے درخت کے نیچے بیٹھ کر مشورہ کرتے رہتے۔ ایک دن سلیمان بھی اُن لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ایک شخص نے کہا:

"بدری کمزور ہو گیا ہے۔"

"بدری کمزور نہیں ہوا بلکہ یوں کہو کہ مر گیا ہے۔" سلیمان نے کہا۔ "میرے کہنے کا مطلب ہے بدری اندر سے مر گیا ہے۔"

آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ گویا کہہ رہا تھا تم سچ کہتے ہو وہ بدری جو کہ ایک جذبہ ہے وہ تو مر گیا ہے۔ اب صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے۔"

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس کا شنکھ لایا کہاں سے جائے..." ایک شخص نے کہا۔

"سچ تو یہ ہے کہ اگر شنکھ نہ ملا تو بدری مر جائے گا۔" سلیمان نے کہا۔

وہ باتوں میں مشغول ہی تھا کہ ریشماں وہاں پر آ گئی۔ ریشماں گاؤں کی اُدھیڑ عمر عورت تھی۔ وہ اس گاؤں میں کب اور کہاں سے آئی کسی کو معلوم نہیں۔ مگر سب جانتے تھے کہ وہ ان پڑھ ہے۔ اتنی ان پڑھ کہ اپنا دستخط بھی نہ کر سکتی تھی۔ انگوٹھا لگاتی تھی۔ یہاں تک کہ اوم کو اللہ اور اللہ کو اوم پڑھتی تھی۔ کبھی کوئی اعتراض کرتا تو صرف اتنا کہتی۔ یہ پڑھے لکھوں کا کام ہے وہ جانیں، مجھے تو دونوں ایک ہی جیسے لگتے ہیں۔ اُس کا جی کرتا تو مندر میں گھنٹی بجاتی، جی کرتا تو نماز پڑھتی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی اور آنکھوں میں آنسو۔ اُس نے آتے ہی پوٹلی سلیمان کے ہاتھ میں تھما دی اور رونے لگی۔

"کیوں روتی ہو؟" سلیمان نے پوچھا۔ مگر ریشماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلیمان کے اصرار کرنے پر ریشماں نے زبان کھولی اور کہنے لگی:

"یہ پوٹلی لو ——"

"اس پوٹلی کے اندر کیا ہے؟" سلیمان نے پوچھا۔

"اس پوٹلی کے اندر میری تین پشتوں کی پونجی ہے۔ میرے زیور بیچو اور بدری کے لیے کہیں سے نیا شنکھ لے کر آ دو۔"

ریشماں کی پونجی وہ پوٹلی تھی۔ ریشماں اُسے ہمیشہ اپنے پاس رکھتی تھی۔ کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتی تھی۔ ایک بار ریشماں بیمار ہوئی اور موت کے قریب پہنچ گئی مگر اُس نے کسی کو بھی ان زیوروں کو ہاتھ نہیں لگانے دیا۔ پھر گاؤں والوں نے پیسے اکٹھے کیے اور اس کا علاج کروایا۔

سلیمان ریشماں کے یہ لفظ سُن کر حیران ہو گیا۔ پھر اُس نے رُوندھی آواز میں کہا۔

"تم یہ پوٹلی لے جاؤ۔ تمھارے زیورات نہیں بکیں گے اور بیدری کا شنکھ بھی بجے گا۔"

"وہ کیسے؟" ریشماں نے روتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کل ہی بتاؤں گا۔" سلیمان نے کہا۔ "کل صبح سورج نکلنے سے پہلے سب لوگ بدری کے گھر سے چند گز کے فاصلے پر کھڑے ہو جائیں۔" سلیمان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے لوگوں کو یہ ہدایت دی۔ بدری کے آبا و اجداد صدیوں سے یہاں رہ رہے تھے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ اچھا ہو گا کہ کشمیر کے وجود کے ساتھ ہی بدری کا وجود بھی ہوا۔ بدری کے پوروجوں کے شنکھ بجانے کے ساتھ ہی یہاں پر نماز بھی شروع ہوئی تھی۔ اس لئے آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کشپ رشی ہندو تھا یا مسلمان مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے شنکھ بھی بجایا اور نماز بھی پڑھی۔

نماز لگتا ہے دُنیا میں سب سے پہلے یہیں پر پڑھی گئی۔ اسی دھرتی پر جہاد بھی کیا گیا۔ نفس پر قابو کرنے کے لئے جہاد، دشمنی اور جہالت کو ختم کرنے کے لئے جہاد، حیوانیت پر انسانیت کی جیت حاصل کرنے کے لئے کشپ رشی کو اس دھرتی پر رہنے والے بندوں کے لئے خدا سے رحمتیں مانگنے کی عادت تھی۔ کبھی وہ مشرق کی طرف ہاتھ پھیلا کر بھگوان سے کچھ مانگتا تو اُسے پوجا کہا جاتا۔ جب مغرب کی طرف ہاتھ پھیلا کر مانگتا تو اسے نماز کہا جاتا۔

سلیمان کے کہنے کے مطابق لوگ سُورج نکلنے سے پہلے بدری کے گھر کے قریب اکھٹے ہو گئے۔ پھر سلیمان نے اُن سے کہا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔۔۔ تمام لوگ بدری کے گھر کے باہر کھڑے ہو گئے۔

صُبح کا وقت تھا۔ سُورج ابھی ستاروں سے نکلنے کے لئے اجازت مانگ رہا تھا کہ سلیمان نے اپنا ہاتھ سیدھا کر کے اکڑایا اور تمام لوگوں سے ایسا کرنے کے لئے کہا۔ پھر ہاتھ کے انگوٹھے اور پہلی اُنگلی کی درمیان والی جگہ ہونٹوں پر رکھی اور آواز نکالی۔ پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ لگا کہ شنکھ بج رہا ہے۔ محسوس ہوا کہ ہر نظارہ شنکھ بجا رہا ہے۔ پھولوں کی خوشبوئیں شنکھ کی آواز کے ساتھ بکھریں۔ پانیوں کے بہاؤ میں بھی یہی آواز سُنائی دی۔ لگا کہ اس آواز نے ہی دل کو خاموشی بخشی ہے اور جہلم بہہ نہیں رہا بلکہ اس آواز پر ناچ رہا ہے۔

شنکھ کی آواز سُن کر لوگوں نے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ محسوس ہوا کہ شنکھ اور اذان کی آواز میں کوئی فرق نہیں ہے۔

محسوس ہوا کہ بدری کی بیوی شانتی ایک بار پھر پیدا ہوئی ہے۔ اُس کی لڑکی نے اپنے خوب صورت چہرے سے چاند کو چڑانا شروع کر دیا۔

یہ خوشیاں قبائلیوں کے دلوں میں سخت کانٹوں کی طرح چُبھیں۔ جو ظلم جانتے تھے، نفرت جانتے تھے انھیں یہ خوشیاں کہاں پسند تھیں۔ وہ تو انسانی جسم کے کھیتوں سے ہمیشہ نفرت اور زہر کی فصل ہی اُگانا چاہتے تھے۔

رات کالی تھی۔ قبائلی پریشانی کے عالم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اُنھیں لگتا تھا کہ آسمان اُنھیں گھُور رہا ہے۔ کیپٹن نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"اب یہاں سے بھاگنا ہی پڑے گا۔" "حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔" ساتھ بیٹھے ہوئے سپاہی نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے شنکھ چُراتے وقت بدری کی لڑکی کو دیکھا تھا۔" غلام نام کے قبائلی نے بڑے عجیب طریقے سے بدری کی لڑکی کا ذکر کیا۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔" کیپٹن نے کہا۔

"کیوں انگور کھٹے ہیں؟" ساتھ بیٹھے ہوئے سپاہی نے طنزاً پوچھا۔

"کھٹے نہیں بلکہ یوں کہا جائے کہ انگور کڑوے ہیں۔"

"ایک کام جانے سے پہلے ضرور کرنا ہوگا۔" ساتھ بیٹھے ہوئے سپاہی نے کہا۔

"وہ کیا؟" کیپٹن نے پوچھا۔

"جانے سے پہلے سلیمان کا کام تمام ضرور کرنا ہے۔"

"بالکل کرنا ہے۔" دوسرے سپاہی نے تصدیق کی۔

"مگر کیوں؟" کیپٹن نے پھر پوچھا۔

"ہمیں یہاں کے ہندوؤں سے اتنا خطرہ نہیں جتنا سلیمان جیسے سچے مسلمانوں سے ہے۔"

رات کافی ہو چکی تھی اور شراب ابھی کچھ بچی ہوئی تھی مگر وہ اُسے پینے کے قابل نہیں رہے تھے۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئے۔

صبح کا وقت تھا، دھوپ نکل رہی تھی اور حجام نے ابھی دوکان کھولی ہی تھی کہ سلیمان اُس کے پاس چلا گیا۔ اخبار والے نے اخبار پھینکا۔ حجام دُکان کی صفائی میں مصروف ہو گیا اور سلیمان اخبار پڑھنے میں۔ اتنی دیر میں سلیمان کرسی پر سو گیا۔ حجام نے اُس سے کہا:

"سلیمان بھائی جاگو یہ بوہنی کا وقت ہے اس وقت سونا ٹھیک نہیں ہے۔"

سلیمان اچانک جاگ گیا اور کہنے لگا:

"معاف کرنا بھائی کیا کروں مجبور ہوں۔"

"کیا مجبوری ہے؟" حجام نے پوچھا۔

"رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔" سلیمان نے کہا۔

"کیوں؟" — حجام نے پھر پوچھا۔

"گاندھی تنگ کرتا رہتا ہے۔"

"کیا کہتا ہے گاندھی تم سے؟" "کبھی کسی چیز کے بارے میں مشورہ کبھی کسی چیز کے بارے میں۔" سلیمان نے کہا۔

"میری طرف دیکھو سلیمان میں بھی تو ہوں۔"

"تجھے کیا ہوا؟" "مجھے نہرو رات بھر سونے نہیں دیتا۔"

"کیا کہتا ہے تمھیں؟" سلیمان نے پوچھا۔

"صبح جلدی اُٹھنا اور جہاز پر چڑھ کر جلدی آنا اور میری حجامت کرنا۔" حجام نے کہا اور پھر سلیمان کی طرف دیکھنے لگا۔ سلیمان نے پھر اخبار پڑھنا شروع کر دیا۔ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے واقعی اُس کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ ہو۔

"اچھا بھائی اب بال کٹوالو۔" حجام نے کہا۔ یہ سُن کر سلیمان اُٹھا اور بال کٹوانے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر حجام اُس کے بال کاٹنے لگا۔

حجام سلیمان کے بال کاٹنے میں مصروف ہو گیا۔ اتنے میں نادانی دوکان کے اندر داخل ہوا اور اخبار پڑھنے لگا۔

"نادانی بھائی! پُرانے پیسے نہیں دیے آپ نے۔" حجام نے کہا۔ نادانی نے اخبار پڑھتے ہوئے جواب دیا:

"ذاتیات پر آ گئے ہو۔"

"پیسے مانگ رہا ہوں اس میں ذاتیات کیسی۔" حجام نے کہا۔

"ابھی عبداللہ سے ہاتھ ملا کر آ رہا ہوں۔" نادانی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اس گاؤں کا اب اللہ ہی والی ہے۔ یہاں پر کوئی بھی شخص اب گاندھی، عبداللہ اور نہرو سے کم بات ہی نہیں کرتا!"

سلیمان نے اُس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

"عجیب عالم ہے کسی سے پیسے مانگو تو جواب عبداللہ سے ہاتھ ملا کر آ رہا ہوں۔ اسکول میں ماسٹر بچے کو مارے تو شکایت آزاد سے کم نہیں۔ بجلی نہ آئے تو شیخ کی حکومت پر طنز، کسی کی بھینس مر جائے، یہی تمھاری آزادی ہے، گاندھی سے شکوہ۔ کسی کا نام جواہر ہو تو لوگ خود بخود اُسے نہرو کہنا شروع کر دیتے ہیں۔"

"اور تو اور یہاں کی ہواؤں میں بھی یہ نام بس گئے ہیں۔" حجام نے سلیمان سے

کہا اور پھر بال کاٹ ڈالے۔

"کتنے پیسے؟" سلیمان نے پوچھا۔

"بارہ روپے۔" حجام نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟" سلیمان نے پوچھا۔

"یہ ریٹ لسٹ دیکھو اور یہ نہرو سے پوچھ کر بنائی ہے۔"

سلیمان نے لسٹ دیکھتے ہوئے کہا: "یہ بارہ روپے بال کٹوانے کے کہاں لکھے ہوئے ہیں۔"

"یہ دیکھو ریٹ لسٹ۔"

"دکھاؤ۔" سلیمان نے کہا اور ریٹ لسٹ دیکھنے لگا۔ "مگر یہاں کہاں بال کٹوانے کا ریٹ بارہ روپے لکھا ہوا ہے۔" سلیمان نے پوچھا۔

"جہاں بال کٹوانا لکھا ہے وہ تلاش کر لو اور جہاں بارہ روپے لکھا ہوا ہے وہ تلاش کر لو۔" حجام نے کہا۔

"اچھا بھائی لوٹ لو، نہرو کی حکومت جو ٹھہری۔"

"جاؤ جو کرنا ہے کر لو زیادہ سے زیادہ عبداللہ سے شکایت ہی کرو گے۔"

سلیمان نے جیب سے چھ روپے نکالے اور حجام کو دئے۔

"یہ تو صرف چھ روپے ہیں۔" حجام نے کہا۔

"دیکھتا نہیں میں گنجا ہوں اس لئے آدھے پیسے ہی دوں گا۔" یہ سن کر حجام نے غصے میں آکر کہا: "آزاد اور گاندھی نے لوگوں کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔"

سلیمان وہاں سے سیدھا گھر گیا پھر اس نے اپنے سارے گاؤں کا چکر لگانا شروع کر دیا۔ اس نے دیکھا کہیں اسکول بنانے کے منصوبے بن رہے تھے۔ کہیں اسپتال بنانے کے کہیں سڑک بنانے کے بارے میں سوچا جا رہا تھا۔ قبائلی تقریباً جا چکے تھے۔ مگر اکّے دکّے کہیں چھپے ہوئے تھے۔ بچے صبح وردیاں پہن کر اسکول جاتے تھے تو لگتا تھا کہ زمین پر تتلیاں اُڑ رہی ہیں۔ شام کو بوڑھے چنار

کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر گفتگو کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ چنار کے پتّے کشمیر کی حُسن کی دیوی کو چھپا کر رکھتے ہیں ... چنار کے درخت اُگنے کے ساتھ ہی کشمیر کا وجود سامنے آیا تھا۔ کبھی کبھی لگتا ہے کہ چنار کا بیج جنت سے فرشتوں نے یہاں پھینکا ہو۔

ایک دن اچانک ریڈیو پر خبر آئی ... "مہاتما گاندھی کی ہتیا کر دی گئی"...

غضب ہو گیا۔ ایک شخص نے کہا۔

"یہ ظلم ہے ... یہ انسانیت کا قتل ہے۔" مختلف لوگوں نے اپنے طریقے سے احتجاج کیا۔ اتنے میں زور کی آندھی چلی اور چنار کے پتّے نیچے گرنے لگے۔ لگا کہ آسمان پر فرشتے بھی اس قتل کے خلاف احتجاج کر رہے ہوں۔ یکا یک جہلم کا پانی سُرخ ہو گیا۔ گویا قتل تو دہلی میں ہوا مگر لہو سری نگر میں بہا۔ لوگ الگ الگ ٹولیوں میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے:

"آخر گاندھی کو کیوں مارا گیا؟" ایک شخص نے پوچھا۔

"یہ سوال فضول ہے اور نہ ہی اس کا کوئی جواب ہے۔"

"مگر کیوں؟" پہلے شخص نے پھر پوچھا۔

"کیوں کہ اس کے بعد تم یہ بھی پوچھو گے کہ عیسیٰ کو سُولی پر کیوں چڑھایا گیا تھا۔"

عبدل بھی لوگوں کے اس گروہ کے ساتھ آکر باتوں میں مشغول ہو گیا۔ اور گاندھی کی موت کا افسوس کرنے لگا۔ اتنے میں ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اور اُس نے کہا ... "غضب ہو گیا، ظلم ہو گیا ..." اتنے میں ایک اور شخص دوڑتا ہوا آیا اور آتے ہی چیخنے لگا:

"غضب ہو گیا، ظلم ہو گیا۔" عبدل نے گھبراتے ہوئے پوچھا:

"کیا ہوا بھائی ...؟"

"سلیمان کو گولی مار دی گئی ..."

"کیوں مار دی گئی؟" ساتھ والے شخص نے پوچھا۔

عبدُل ساری بات سمجھ گیا اور ایک دم اُس شخص کے سوال کا جواب دینے لگا:
"گاندھی کو کیوں گولی ماری گئی۔" سب لوگ وہاں سے بھاگے اور اُس جگہ چلے گئے جہاں سلیمان کی لاش خون سے لتھڑی پڑی تھی —— چاروں طرف خاموشی چھاگئی۔ لگتا کہ ہوا بھی ماتم کر رہی ہے۔ اس لئے لفظوں نے ہونٹوں سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا تھا۔

سلیمان اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کے ماں باپ بچپن میں ہی مر گئے تھے اور وہ لوگوں کی خدمت میں اتنا مصروف تھا کہ اُسے اپنے بارے میں کچھ کرنے کی فرصت ہی نہ ملی تھی۔ بچپن سے ہی وہ مندر میں پلا تھا۔ اُسے پجاری کے باپ نے پالا تھا۔ جب سلیمان بڑا ہوا تو اُسے پجاری کے باپ نے بتایا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ اور اُسے نماز اور روزوں کی اہمیت بھی بتائی تھی پجاری کے باپ نے ہی اُسے اسلام کے اُصولوں پر چلنے کا طریقہ بھی سمجھایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ سچا مسلمان کیا ہوتا ہے۔

پجاری کے باپ سے تعلیم لینے کے بعد سلیمان سچا مسلمان بن گیا تھا۔ پجاری کے باپ نے پجاری کو تعلیم دے کر سچا ہندو بنایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس گاؤں میں سنکھ بجنے کے ساتھ ہی نماز شروع ہوتی تھی۔ لوگ آپس میں ہندوؤں مسلمانوں کی طرح نہیں بلکہ انسانوں کی طرح رہتے تھے۔ پجاری کے احترام میں سُلیمان نے بھی وہ قانون بنانے کی آواز اُٹھائی تھی جس میں گئو کشی جُرم ہے۔

سُلیمان کے دل میں سارے گاؤں کا درد تھا۔ کھانا کھانے سے پہلے وہ دیکھ لیا کرتا تھا کہ اُس کے پڑوسیوں میں سے کوئی بھوکا تو نہیں ہے۔ وہ سچ بولتا تھا۔ گاؤں کی لڑکیوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ پانچوں وقت نماز پڑھتا تھا۔ حالانکہ اسلام کی تعلیم اُس نے کسی مولوی سے نہیں بلکہ پجاری کے باپ سے حاصل کی تھی۔ اُس سلیمان کو آج قتل کر دیا گیا تھا۔

لوگوں نے سلیمان کی لاش کو اُٹھایا اور قبرستان میں لے گئے۔ پنڈتوں نے اوم نمو شوائے کہتے ہوئے اور مسلمانوں نے اللہ اکبر کی آوازوں کے

درمیان اُسے دفنا دیا۔ تمام گاؤں کے لوگوں نے اُس کی قبر پر مٹی ڈالی۔

جب سلیمان کی قبر پر لوگ مٹی ڈال رہے تھے تو عبدُل کو لگ رہا تھا کہ لوگ قبائیلیوں کے گناہوں پر مٹی ڈال رہے ہیں۔ گویا اُنھیں معاف کر رہے ہیں۔ ساری بات اللہ پر چھوڑ رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں گناہ سے نفرت کرو گنہگار سے نہیں۔

کچھ دیر تک عبدُل پریشانی کے عالم میں گھر سے بھی باہر نہیں نکلا۔

ایک دن عبدُل نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا کہ سُلیمان کا لہو پھولوں سے نمایاں ہو رہا ہے۔ کھیتوں میں فصل بن کر خوشبو دے رہا ہے۔

مندر کی گھنٹیوں اور مُلّاؤں کی اذانوں کے اندر عبدُل نے سلیمان کی آواز محسوس کی۔

اس سے عبدُل کے دل کو راحت نصیب ہوئی۔ اور اُس نے سلیمان کا شمار بھی شہیدوں میں کر دیا۔ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہی اُسے لگا کہ سلیمان گاؤں کی زندگی ہے۔ اس لئے لوگ اس کا ماتم کرتے ہوئے جی رہے ہیں۔

عبدُل گھر سے باہر آیا۔ اُس نے دیکھا کہیں اسکول بن رہے ہیں۔ کہیں اسپتال، کہیں پُل، کہیں سڑکیں —— پھر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:

"سلیمان کا غم تو زمین کے ذرّوں اور آسمان کے ستاروں میں بھی ہے۔"

عبدُل نے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا اور یہ اعلان کیا: "یہ سچ ہے کہ گاندھی اور سلیمان کا قتل انسانیت کا قتل ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ یہ قتل ایک ہی طرح کی سوچ رکھنے والوں نے کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس سے انسانیت اور بھی مضبوط ہوئی ہے۔۔۔" عبدُل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔۔ "یہ بھی سچ ہے کہ سلیمان اور گاندھی کا لہو اس زمین کو سینچ رہا ہے۔ اور وہاں سے وہ پھول پیدا ہوں گے جو انسانیت کی خوشبو کو ہر طرف

پھیلائیں گے۔"

یہ سُن کر سب لوگوں نے مِل کر کہا۔۔۔"اوم نموشوائے، اللہ اکبر۔" عبدُل نے نعرہ لگایا۔۔۔"شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مُسلم سکھ اتحاد۔" بات جاری رکھتے ہوئے عبدُل نے پھر کہا۔۔۔"قبائلی تو بھگا دیے گئے ہیں اور ہر طرف امن و امان انگڑائیاں لے رہا ہے۔ یہاں سے دُور کھیر بھوانی کا میلہ لگتا ہے جہاں ہندو پُوجا کرتے ہیں اور ایسا کرنے کے لیے مسلمان اُنھیں پھول دیتے ہیں۔ وہاں جاکر گہری نیند سونا چاہتا ہوں۔"

"مگر کیوں؟" ایک بچّے نے سوال کیا۔

"تھک گیا ہوں۔ سنہ ۱۹۳۱ء سے آج تک لڑائی لڑ رہا ہوں۔ غربت کے خلاف، تعصّب کے خلاف، جہالت کے خلاف۔" یہ کہہ کر عبدُل وہاں سے چلا گیا۔ اور کہنے لگا۔۔۔"لوگ تو مر کر جنت میں جاتے ہیں مگر میرے اللہ نے مجھے زندگی میں ہی جنت نصیب کی ہے —— یہ کشمیر جنت ہی تو ہے۔" یہ کہہ کر عبدُل سو گیا۔

اِدھر کشمیر میں آزادی کے گُلاب نے اپنی خوشبو پھیلانا شروع کر دی۔ اسکول تعمیر ہونے لگے، سڑکیں تعمیر ہونے لگیں۔ مندروں میں پُوجا ہونے لگی۔ مسجدوں میں سج دھج کر لوگ نمازیں پڑھنے لگے۔ جھیلوں کے اندر شکارے چلنے لگے۔ ہوائیں جھومتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ تھیٹروں میں ڈراما دیکھنے والوں کا رش اور مشاعروں میں واہ واہ کی آوازوں نے کشمیر کے قدرتی حسن کو اس طرح سنوارا جس طرح خوب صورت دوپٹے کو کناری سنوارتی ہے۔

میونسپلٹی اور پنچایت کے چُناؤ میں دکھایا جانے والا جوش جہلم کی نہروں سے نمایاں ہونے لگا —— ۱۵ راگست اور ۲۶ رجنوری لوگوں کے قومی تہوار بن گئے —— سیّاح گرمیوں کے علاوہ سردیوں میں بھی آنے لگے۔

کنول کے پھول یوں لگا جیسے کھلتے ہی نہ ہوں بلکہ باتیں کرتے ہوں۔ تیرہ[۱۳] جولائی کو سارا کشمیر سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا تھا، لوگ آسمان کی بلندیوں کی طرف دیکھتے تھے۔

برس بیتتے گئے —— مگر اصل میں لوگ بیت رہے تھے۔ کہا تو جاتا ہے کہ وقت بیتتا ہے مگر اصل میں لوگ بیتتے ہیں۔ اِدھر عبدُل آرام سے بے فکر سویا ہوا تھا۔

لگتا تھا کہ عبدُل گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے۔ بے فکر عبدل اُس کی نیند سے لگ رہا تھا کہ اسے معلوم ہے کہ اُس کی آزادی کی حفاظت ہو رہی ہے۔ انسانی قدریں محفوظ تھیں۔ گو سلیمان زندہ نہیں تھا مگر اُس کی آواز وہاں پر گھوم رہی تھی۔ سچ کی آواز، انسانیت کی آواز، حق کی آواز، اسلام کی آواز۔

اسلام کی آواز ہر وقت گھومتی رہتی ہے۔ اس کائنات میں لوگوں کو زندگی دیتی ہے، پھول کھلاتی ہے۔ دریاؤں کو بہاتی ہے۔ ہوائیں جس کے کہنے پر سرسر کرتی ہیں۔

اذان سُن کر لگتا ہے کہ سُورج کہہ رہا ہے کہ میں جاگ رہا ہوں۔ اُٹھو اُٹھو پھر کائنات کا ساز مندروں میں گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ بجتا ہے۔ آہستہ آہستہ خراماں خراماں صبح نمودار ہوتی ہے۔

ایک دن اچانک دھماکہ ہُوا اور عبدُل جاگ گیا۔ اُس نے گھبرا کر پوچھا:

"یہ دھماکہ کہاں ہوا ہے؟ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔" اس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آواز اتنی خوں خوار کیوں ہے؟" اس کی یہ بوکھلاہٹ دیکھ کر چند لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

"کون سی آواز؟" ایک شخص نے عبدُل سے پوچھا۔

"جو ابھی میں نے سُنی۔" ... "یہ آواز۔" ایک شخص نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھائی یہی آواز!"۔ "تو اس میں نئی بات کون سی ہے۔ یہ تو معمولی آواز ہے۔ ایسی کئی آوازیں یہاں پر برسوں سے آ رہی ہیں۔" دوسرے شخص نے عبدُل سے مخاطب ہو کر کہا:

"یہ سچ تو یہ ہے کہ لوگ برسوں سے یہاں ایسی ہی آوازیں سُن رہے ہیں مگر انھوں نے کبھی احتجاج نہیں کیا۔"

"کمال کرتے ہوئے بھائی، کلیجہ دہل گیا ہے۔ خون رگوں میں روشنی کی رفتار سے بھی تیز دوڑ رہا ہے۔ اور تم کہتے ہو کہ معمولی سی آواز ہے۔"

"یہاں اس سے بھی بڑے بڑے دھماکے ہو رہے ہیں۔" تیسرے شخص

نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی یہ عام دھماکہ نہیں ہے۔ اس دھماکے نے میری برسوں کی نیند میں خلل ڈالا ہے۔ میری رُوح کو زخمی کر دیا ہے۔ اور تو اور جنت میں گاندھی، نہرو اور عبداللہ بھی کانپ گئے ہیں۔" عبدُل نے کہا۔

لوگ اُسے حیرانی سے دیکھنے لگے۔ پھر ایک نوجوان نے اُس سے پوچھا:

"کون ہو تم؟"

"میں عبدُل ہوں۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو۔"

"میں نوائی پورہ کا رہنے والا ہوں۔"

زور سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہر طرف ڈر کا ماحول چھا گیا۔ یوں محسوس ہوا کہ یہ تو صرف دھرتی ہے۔ یہاں پر آسمان بھی بے بس ہے۔ وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا۔

"یہ آوازیں کیسی ہیں، اور گولیاں کون چلا رہا ہے..." عبدُل نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔ ... "تمھیں معلوم نہیں ہم آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہیں..." نوجوان نے پھر اپنی بات دُہرائی۔

"مگر وہ لڑائی تو ہم کب کی لڑ چکے ہیں اور کیا ہم پھر غلام ہو گئے ہیں۔" عبدُل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"چُپ رہ بُڈھے۔" ایک نوجوان نے عبدُل سے کہا۔

"یہی تمھاری تمیز ہے۔" عبدُل نے نوجوان سے سوالیہ لہجے میں بات کی —— دوسرے نے عبدُل کے منہ پر تھپّڑ مار دیا۔ عبدُل یہ سب کچھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اُسے لگا کہ وہ کشمیر میں نہیں ہے بلکہ کہیں اور ہے —— پھر اُس نے چاروں طرف دیکھا، وہی پہاڑیاں، وہی دریا، وہی چناروں کے درخت، پھر

اُسے خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کشمیر کے لوگ یہاں سے بھاگ گئے ہوں۔ اور کوئی دوسرے لوگ یہاں آ گئے ہوں۔

عبدُل نے کانپتے ہوئے کہا۔۔ "میں ابھی مدرسے میں جا کر استاد سے پوچھتا ہوں کہ یہی تعلیم تم بچوں کو دیتے ہو؟"

یہ کہہ کر عبدُل وہاں سے آگے بڑھا۔ وہ تمام لوگ اس پر ہنسنے لگے۔ لگا کہ ان کی تہذیب، ان کا ماضی اُن سے دور کھڑا آگے بڑھ رہا ہے اور وہ اُس پر ہنس رہے ہیں۔

عبدُل اسکول کے پاس چلا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ باہر تو اسکول کا بورڈ لگا ہوا ہے۔ مگر اسکول کی عمارت ٹوٹی ہوئی ہے۔ کچھ جوان وہاں پر بیٹھ کر شراب پی رہے ہیں۔ وہ تمام لوگ ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں جس کو ان لوگوں نے خود شراب پی کر کے بہت سی جگہوں سے کاٹا ہوا ہے اور اس چارپائی پر ایک چادر ہے جو بہت سی جگہوں سے پھٹی ہوئی ہے۔۔۔ عبدُل کو لگا جیسے ہندوستان چارپائی ہو اور کشمیر چادر۔

عبدُل نے حیرانگی سے ایک لڑکے سے پوچھا: "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"دیکھتے نہیں۔" ایک نوجوان نے شراب کی بوتل ختم کرتے ہوئے کہا۔

"کیا یہاں کے مدرسے ختم ہو گئے ہیں۔" عبدُل نے پھر حیرانگی سے پوچھا۔

"ہاں بھائی ختم ہو گئے ہیں۔ اب یہاں پر آزادی کی لڑائی لڑنے کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ اور جہاد کرنے کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔"

"یہ جہاد کس کے خلاف ہے؟"

"ہندوستان کے خلاف۔"

"مگر ایک سچا مسلمان تو جہاد بُرائی کے خلاف کرتا ہے۔ نفرت کے خلاف کرتا ہے۔"

"چُپ رہ بُڈھے" یہ شراب پیتے ہوئے دوسرے لڑکے نے کہا۔

"تمھیں معلوم نہیں کہ ہم غلام ہیں۔"

"کس کے غلام؟"

"ہندوستان کے غلام۔" ————

"مگر تم تو خود ہندوستانی ہو۔"

"ہم مذہبی طور پر غلام ہیں۔" دوسرے لڑکے نے کہا۔

"کیا یہاں پر نماز پڑھنے پر پابندی ہے، نیکی کرنے پر پابندی ہے۔" عبدُل نے پھر سوالیہ لہجے میں بات کی۔ اُس نے دیکھا کہ پولیس کی ٹکڑی وہاں سے گزری اور اُن لڑکوں نے اس پر فائر کر دیا۔ پھر پولیس والوں نے بھی فائر کیا۔ چند منٹ تک یہ فائرنگ چلتی رہی۔ اسی درمیان ایک عورت وہاں سے گزری اُسے گولی لگی اور مر گئی۔ اصل میں وہ دو گولیوں سے مری۔ ایک گولی اُسے پولیس کی لگی اور دوسری گولی اُن لڑکوں کی ———— کچھ دیر بعد وہ لڑکے بھی وہاں سے بھاگ گئے اور پولیس بھی۔

عبدُل نے اُس عورت کی لاش اُٹھائی اور محسوس کیا کہ اُس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ اُس نے دل ہی دل میں سوچا یہ تو مر گئی ہے شاید اس کا بچہ زندہ ہو۔ عبدُل نے چیخ کر کہا:

"ارے بھائی کوئی ہے، کوئی ہو تو آؤ اسے اسپتال لے چلیں۔"

مگر کوئی بھی شخص وہاں پر نہیں آیا۔ عبدُل اُس عورت کے سرہانے بیٹھ کر رونے لگا۔ پھر اور روتا ہی گیا۔

رات ہو چکی تھی۔ گلیوں میں کُتے بھونک رہے تھے۔ ایک عجیب سا سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ عبدُل نے محسوس کیا کہ یہ عورت کی نہیں بلکہ کشمیر کی تہذیب کی لاش ہے۔

عبدُل نے پھر خود ہی اُس لاش کو اُٹھایا۔ اُسے لگا کہ اس لاش کو وہ نہیں بلکہ نہرو، آزاد اور عبداللہ اُٹھا رہے ہیں۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں اُس نے محسوس کیا کہ لوگ اس عورت کے ماتم میں اُس کے ساتھ ہیں مگر قریب آنے سے کترا رہے ہیں۔ وہ اُس لاش کو اُٹھا کر ڈسپنسری لے گیا۔ اُس نے دیکھا کہ ڈسپنسری بھاؤں

کے قبضہ میں ہے اور ان کے ساتھ کشمیری لڑکے بھی ہتھیار اُٹھا کر کھڑے ہیں۔ عبدُل نے حیرانگی سے ایک لڑکے سے پوچھا:

"کیا یہ گاؤں نوائی پورہ کی ڈسپنسری ہے۔"

"کان نہ کھا بوڑھے، اندھا ہے کیا۔" ایک نوجوان نے جواب دیا۔

اُسے لگا کہ شیرِ کشمیر، کشمیر کے یہ حالات دیکھ کر لوگوں سے پوچھ رہے ہیں: کیا یہی کشمیر ہے، اور انھیں یہی جواب مل رہا ہے:

"کان نہ کھا بوڑھے۔"

عبدُل نے پھر جرأت کی اور ایک بوڑھے پٹھان کے پاس چلا گیا اور جاتے ہی پوچھا:

"یہ نوائی پورہ ہی ہے نا؟"

"ہاں بھائی نوائی پورہ ہی ہے۔" اس بوڑھے پٹھان کو مجبوراً تمیز سے یہ بات کہنی پڑی۔

"پھر یہ گاؤں کی ڈسپنسری ہی ہے نا۔"

"ہاں بھائی یہ ڈسپنسری تھی مگر اب نہیں ہے کیونکہ آزادی کی اس لڑائی میں ڈسپنسری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"بھائی میں سب اس لئے پوچھ رہا ہوں کیونکہ یہ عورت مر گئی ہے مگر یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا بچہ زندہ ہو۔" عبدل نے کہا۔

یہ سنتے ہی ایک پٹھان نے اس عورت کے پیٹ میں گولی مار دی اور کہنے لگا:

"یہ لے اسے بھی مار دیا۔"

"اللہ یہ کیا ہو گیا ہے۔" یہ کہہ کر عبدُل نے اپنے سر کے بال نوچنے شروع کر دیے۔ پھر چاروں طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کشمیری لڑکے جو پٹھانوں کے ساتھ تھے پریشان ضرور ہوئے مگر پھر پٹھانوں کے ساتھ ہی چل دئیے۔ . .

عبدُل نے اس عورت کی لاش کو باہوں میں اُٹھایا ہی تھا کہ زوروں کی بارش

برسنے لگی اور لگا کہ کُتے بھونک نہیں بلکہ چیخ رہے ہیں۔ عبدُل نے آسمان کی طرف دیکھا اُسے لگا کہ وہ بھی بے بس ہے۔ پھر اُس نے زور سے کہا:

"کہاں ہو شیخ کہاں ہو اپنی تحریک کا انجام آؤ اور اچھی طرح دیکھ لو اور سُنو، میری باہوں میں کشمیر کی لاش ہے اور اس کے اندر جو بچہ ہے وہ کشمیر کا مستقبل ہے۔ تم کیوں مر گئے شیخ۔ شیخ اُٹھو جلد اُٹھو۔ اپنی قبر سے اُٹھو۔" پھر عبدُل نے اس عورت کی لاش زمین پر رکھ دی اور کہنے لگا۔

"میری بیٹی میں شاید تجھے دفنا بھی نہ سکوں۔" پھر گولیوں کی آواز آنے لگی۔ عبدُل نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی بھاگ رہی ہے پھر وہ لڑکی عبدُل کے قریب سے گزری۔ عبدُل نے اسے زور سے کہا:

"رُکو۔"

مگر وہ لڑکی رُکی نہیں اور آگے بڑھ گئی۔ پھر عبدُل بھاگا اور زور سے اُس لڑکی سے کہنے لگا:

"میں کہتا ہوں رُکو۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔" لڑکی نے کہا۔ اور آگے بڑھ گئی۔

"مگر کہاں جا رہی ہو؟"

"دیکھتے نہیں، جا نہیں بلکہ بھاگ رہی ہوں۔" لڑکی نے کہا۔

"مگر کس کے ڈر سے بھاگ رہی ہو۔"

"ایک پٹھان میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔" لڑکی نے جواب دیا۔ اور آگے بھاگ گئی۔ . .

پھر عبدُل چیخا اور کہنے لگا۔ . "پٹھانوں کو یہ اجازت کس نے دی کہ وہ ہماری ہی دھرتی پر آ کر ہماری بہو بیٹیوں کی عزت لوٹیں۔" . . . . مگر وہاں عبدُل کی چیخوں کو سننے والا کوئی نہ تھا۔ یوں لگتا تھا ہر چیز بہری ہو گئی ہے . . . . . دریاؤں کی روانی کی آواز کو خاموشی کھا گئی ہے۔ معصوم لڑکیوں کے ہونٹوں پر سناٹوں کا پہرہ لگ گیا ہے۔ محسوس ہوتا تھا کہ شب رشی کی دھرتی کو یہ لوگ تباہ کر رہے ہیں۔ اور رشی اپنی

بوسیدہ کتابوں کو سنبھالنے کے قابل بھی نہیں رہا جن پر لفظ محبت لکھا ہوا ہے۔

عبدُل کی آواز سُن کر ایک شخص باہر آیا اور عبدُل سے گویا ہوا۔

"یہ جاننا چاہتے ہو کہ پٹھانوں کو یہ حق کس نے دیا۔" اُس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آسمان کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟" عبدُل نے اُس شخص سے پوچھا۔

"اس لئے کہ دھرتی سے نظریں نہیں ملا سکتا۔" اس شخص نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا سُنو تم جس کے لئے پوچھ رہے ہو اور وہ وجہ اچھی طرح سُن لو، جب گھر کا مالک خود دیواروں میں چھوٹے سوراخ رکھتا ہے تو محلّے کے لوگ انھیں ضرور بڑا کر دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ شخص خاموش ہو گیا۔

رات اور زیادہ کالی ہو گئی۔ کُتّے اور زیادہ ڈراؤنی آواز میں بھونکنے لگے۔

"مَیں سمجھ گیا۔ مَیں اچھی طرح سمجھ گیا۔ گولیاں کیوں چل رہی ہیں، لوگ کیوں مر رہے ہیں۔ اب کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں ہے۔" عبدُل نے یہ بات زور سے کہی۔ اُس کی آواز سن کر ایک شخص اُس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اس سے کہنے لگا۔

"اگر تم سمجھ گئے ہو تو ہم کو بھی سمجھاؤ۔"

"سُنو اچھی طرح سُنو! جب لوگ نماز پڑھنا چھوڑ دیں گے تو گولیاں ہی چلائیں گے۔ جب زکوٰۃ نہیں دیں گے تو چوری کریں گے اور چوری کے سوا کچھ بھی نہیں کریں گے . . ."

عبدل یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور پھر چاروں طرف دیکھنے لگا پھر اپنے آپ سے مخاطب ہو گیا۔

"جب انسان کی بات کوئی دُوسرا نہیں سُنتا تو وہ اپنے آپ سے مخاطب ہو جاتا ہے۔ سوال کرنے لگتا ہے۔ عبدُل نے اپنے آپ سے سوال کیا:

"بدری بدری تم کہاں چلے گئے ہو۔" یہ کہہ کر عبدُل دوڑا۔ اتنا تیز دوڑا کہ گر گیا مگر پھر خود ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ وہ سیدھا بدری کے گھر پہنچا۔ اس نے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ پھر اس نے زور سے دھکّا مارا مندر کا دروازہ کھُل گیا۔ اس نے دیکھا وہاں پر کوئی نہیں۔ مندر جو کہ بدری کا گھر بھی تھا، سنسان پڑا ہے پھر بارش برسنے لگی۔ عبدُل نے ایک شخص سے مخاطب ہو کر کہا:

"پہلے تو یہ گاؤں اتنا سنسان نہیں لگتا تھا جتنا کہ آج لگ رہا ہے اور کتّوں کا بھونکنا بھی عجیب لگ رہا ہے بلکہ یوں لگتا ہے جیسے کتّے بھونک نہ رہے ہوں بلکہ سوال کر رہے ہوں"۔ . عبدل یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"کون ہو تم؟"

"مَیں عبدُل ہوں۔"

"کون عبدُل؟" اُس شخص نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔

"مَیں کبھی اس گاؤں میں رہتا تھا۔"

"اب یہاں پر کیا تلاش کرنے آئے ہو؟"

"کیوں کہ اس گاؤں میں کون کب رہا کرتا تھا اس بات کی بالکل کسی کی پرواہ نہیں ہے۔" اس شخص نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اس مندر میں بدری رہا کرتا تھا۔"

"بدری بھاگ گیا ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"غلط بالکل غلط۔ بدری یہاں سے کبھی بھاگ نہیں سکتا۔" عبدُل کو یوں لگا کہ یہ کہہ کر بدری بھاگ گیا ہے اس شخص نے اُسے گالی دی ہو۔

"اچھا اگر بھاگا نہیں تو یوں سمجھو کہ چلا گیا ہے۔" . . "اگر چلا گیا تو پھر تُم نے اُسے روکا کیوں نہیں؟" "وہ ہمارے راز فوج کو دیتا تھا۔"

"میں سمجھ گیا، مَیں اچھی طرح سمجھ گیا کہ اس گاؤں کے لوگ اب نماز کیوں

نہیں پڑھتے، کیونکہ ہوری اب یہاں پر شنکھ نہیں بجاتا۔"

عبدل نے چیخنا شروع کر دیا۔ ۔ ۔ "سلیمان او سلیمان کہاں ہو تم بھائی۔ ۔"

مگر آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔

"میں پاگل ہو گیا ہوں ارے میں پاگل ہو گیا ہوں۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ سلیمان مر گیا ہے اسے اور گاندھی کو ایک ہی دن گولی ماری گئی تھی۔ ۔ ۔ میں اسے بلا رہا ہوں۔"

پھر عبدل دوڑا اور اس نے سلیمان کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ۔ ۔ اور آواز دی:

"بھابھی بھابھی۔ ۔ ۔" اس کی آواز سن کر اندر سے ایک ادھیڑ عمر کی عورت آئی اور اس نے عبدل سے پوچھا:

"کس سے ملنا چاہتے ہو؟"

"یہ سلیمان کا گھر ہے۔" عبدل نے اپنی بات دہرائی۔

"ہاں بھائی یہ بدنصیب سلیمان کا گھر ہی ہے۔ ۔ ۔ اور میں اس گھر کی نوکرانی ہوں۔"

"صرف نوکرانی مگر باقی لوگ کہاں گئے۔"

"ساجدہ تو سلیمان کی موت کے کچھ عرصے کے بعد ہی مر گئی تھی۔"

"بھابھی ساجدہ میرے سلیمان کی سادہ، خوب صورت اور مہمان نواز بیوی کیسے مر گئی۔" یہ کہہ کر عبدل رونے لگا۔

"اب یہاں پر لفظ کیوں اور کیسے ختم ہو گیا ہے۔" اس عورت نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"لوگ قتل ہو رہے ہیں، مگر کیوں پر کسی کو سوچنے کی فرصت نہیں۔"

"پھر بھی سلیمان کی بیوی کو ہوا کیا؟" ۔ ۔ ۔ عبدل نے یہ بات اتنی پریشانی سے کہی کہ وہ یہ بھی بھول گیا کہ سلیمان کی بیوی کا نام ساجدہ تھا اور وہ اسے

ساجدہ بھابھی کہہ کر بلایا کرتا تھا۔

"بے انصافی اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنا سلیمان نے گاندھی اور شیخ سے سیکھا تھا اور سلیمان کی بیوی نے اس سے، کاش یہ دونوں نہ پیدا ہوئے ہوتے اور نہ ہی سچائی کا پرچار کرتے اور نہ ہی ساجدہ مرتی۔ ۔ ۔" اس عورت نے عبدل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

عبدل کو لگا کہ گاندھی اور عبداللہ کو برا بھلا کہہ کر وہ عورت بھی ظلم کے خلاف احتجاج کر رہی ہے۔ اسے یاد آیا کہ کس احترام سے لوگ کہا کرتے تھے کہ گاندھی اور عبداللہ یہاں کی ہواؤں میں بس گئے ہیں۔

میں جاننا چاہتا ہوں کہ آخر ساجدہ کو ہوا کیا؟" عبدل نے پوچھا۔

"ایک بار گاؤں میں لگاتار تین چار دن تک پانی نہیں آیا۔ لوگ پریشان ہو گئے معلوم ہوا کہ محکمے والوں نے رشوت کھائی ہے۔ ۔ ۔" اس عورت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ۔ ۔ "لوگوں نے جلوس نکالا۔ اور اس کی رہنمائی ساجدہ نے کی۔ پولیس نے گولی چلائی اور ساجدہ مر گئی۔ ۔ ۔" وہ عورت نہیں دلیری تھی، ساجدہ کشمیر کی عزت تھی، وہ سلیمان کی بیوی تھی۔ وہ سلیمان جو کشمیر کی آزادی کی لڑائی لڑا، شیخ کے اصولوں کے لیے لڑا۔" یہ کہہ کر عبدل چیخ پڑا۔

"سلیمان کی ایک لڑکی اور دو لڑکے بھی تھے۔" عبدل نے یاد کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"سلیمان کی بیٹی مر گئی ہے اور بیٹے موت کا انتظار کر رہے ہیں۔" عورت نے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" ۔ ۔ ۔ عبدل نے پھر سوال کیا۔

"مت پوچھ اے اجنبی مت پوچھ۔"

عبدل اس عورت کی طرف دیکھنے لگا۔ ۔ ۔ اسے لگا کہ اس کی آنکھیں

کہہ رہی ہوں . . . یہاں پوچھنا منع ہے۔ پھر اپنے آپ سے بغاوت کرتے ہوئے عبدل نے پوچھا ———

"میں ضرور پوچھوں گا۔ پوچھنا میرا بنیادی حق ہے۔ یہ حق مجھے نہرو نے دیا ہے۔ شیخ نے دیا ہے بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ حق مجھے کشپ رشی نے دیا ہے۔"

"سنو!" اس عورت نے بات شروع کی . . . "سلیمان کے بیٹوں کا نام اکبر اور رشید تھا۔ اور بیٹی کا نام نجمہ تھا۔" یہ کہہ کر وہ عورت چپ ہوگئی۔

"کہانی جاری رکھو۔" عبدل نے اُس سے کہا۔

ایک دن رشید اور اکبر گھر میں نہیں تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ماگرواد شروع ہوچکا تھا۔ کچھ پٹھان گھر کے اندر زبردستی داخل ہوئے۔ ایک نے آتے ہی مجھ سے کہا:

"ہم آزادی کے سپاہی ہیں۔"

"پھر بے اندمت آئیے بابا"

"کیوں؟" پٹھان نے پوچھا۔

"گھر میں کوئی فرد نہیں ہے۔" اُس عورت نے داستان سناتے ہوئے کہا۔

"پھر مرد کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" اتنے میں دوسرے پٹھان نے اندر جھانک کر دیکھا۔ اُس کی نظر نجمہ پر پڑی۔ وہ پہلے پٹھان سے مخاطب ہوکر کہنے لگا۔

"کشمیر کا سیب بہت اچھا ہے اور ساری دنیا میں مشہور ہے۔" دوسرے پٹھان نے کہا . . . "پہلے پٹھان نے پھر کہا:

"جاؤ ذرا کھانا لے کر آؤ۔"

"گھر میں کچھ نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ یہ سُن کر وہ اندر چلا گیا۔ اور پھر کھانے کی چیزیں باہر پھینکنے لگا۔

"جھوٹ بولتی ہو گھر میں کچھ نہیں ہے۔ ہم کشمیریوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔"

یہ کہہ کر عورت چپ ہوگئی۔ عبدل چپ چاپ یہ ساری کہانی سنتا رہا۔ پھر اچانک اُس نے کہا۔ "چپ کیوں ہوگئی ہو کہانی جاری رکھو۔" اس عورت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ پٹھان پھر نجمہ پر جھپٹا۔ وہ چیخنے لگی اور کہنے لگی:

"اللہ مجھے اس درندے سے بچا۔" یہ سُن کر دوسرے پٹھان نے کہا:

"تجھے اب کوئی نہیں بچا سکتا۔ تو تو کیا اب کشمیر کو بھی کوئی نہیں بچا سکتا۔" یہ کہہ وہ خاموش ہوگئی۔ پھر ایک چڑیا کے چہچہانے کی آواز آئی جو یہ کہہ رہی تھی:

"نجمہ کا بلاتکار کیا جارہا ہے۔ حالانکہ مذہبی کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ یہ گناہ ہے۔ آئین کی کتابوں میں یہ جرم ہے۔" کہانی سُنا کے وہ عورت بُت کی طرح کھڑی ہوگئی۔ عبدل نے اسے ہلایا اور کہا:

"سلسلہ جاری رکھو۔"

"پٹھان وہاں سے چلے گئے اور پھر رشید گھر کے اندر داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ نجمہ مرگئی ہے۔ اُس کی لاش صاف ظاہر کر رہی تھی کہ اس کے ساتھ بلاتکار ہوا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر چپ ہوگئی۔

عبدل سوچنے لگا کہ عورت جب مرتی ہے تو اس کی لاش خود بخود بیان کردیتی ہے اس کی موت کی وجہ کیا ہے۔ اُس کا جسم خود بتا دیتا ہے کہ یہ قدرتی موت ہے . . . بلاتکار کی وجہ سے مری ہے، بچہ جنتے ہوئے اس کی موت ہوئی ہے . . . خاوند کے ظلم سے مری . . . یا کسی کے طعنوں سے۔

تنگ آ کر مری ہے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ عورت خود بخود بول اٹھی رشید بھاگا اور سیدھا اگروادیوں کے کیمپ میں چلا گیا۔ کہنے لگا:

"تم لوگوں نے میری بہن کی عزت لوٹی ہے۔"

"ہم نے نہیں پٹھانوں نے لوٹی ہے!" ایک مقامی اگروادی نے رشید کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ پٹھان کشمیر میں تمھاری وجہ سے آئے ہیں۔" رشید نے کہا۔

"حبیب رہو یہ تو آزادی حاصل کرنے کی معمولی سی قیمت ہے۔" ایک نوجوان لڑکے نے رشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا خاک آزادی" —— رشید نے کہا۔

"کیا کہا ہے" دوسرے اگروادی نے غصے سے رشید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چوری کرنا، ظلم کرنا، عورتوں کی عزت لوٹنا ہی تمھاری آزادی ہے" یہ سن کر ایک اگروادی نے رشید کو پکڑنے کی کوشش کی مگر رشید وہاں سے بھاگ گیا۔

رشید پولیس میں بھرتی ہونے کے لئے گیا۔ مگر اس سے دس ہزار روپے رشوت طلب کی گئی۔ اس نے اس کے خلاف احتجاج کیا پھر اسے بھرتی کر لیا گیا۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ پولیس میں بھرتی رشوت لے کر کی جاتی ہے۔ وہ ایک لیڈر کے پاس چلا گیا جو رشوت کے خلاف گھنٹوں بولا کرتا تھا اور اسے کہنے لگا:

"جناب یہ ظلم ہے کہ یہاں پیسے لے کر بھرتی کی جاتی ہے۔" یہ سن کر لیڈر لال پیلا ہو گیا۔ اس نے بڑے افسر کو ٹیلی فون بھی کیا۔ رشید یہ سب کچھ دیکھ کر خوش ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ چلو کوئی نہ کوئی تو ظلم کے خلاف

احتجاج کر رہا ہے۔ مگر دوسرے دن وہ یہ جان کر اور پریشان ہوا کہ یہ ٹیلی فون اس لیڈر نے رشوت کے اندر اپنا حصہ مانگنے کے لئے کیا تھا۔ اس بات کا اس کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ کیوں کہ سلیمان کا لہو اس کے اندر کھول رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ سلیمان ٹھیک ہی کہا کرتا تھا۔ اس کھیت کا کیا ہوگا جسے باڑ ہی کھانے لگے۔ کہانی سنتے ہوئے عبدل بیچ میں بول پڑا۔

"ہاں بھائی سلیمان ٹھیک ہی کہا کرتا تھا"۔ "پھر کیا ہوا" عبدل نے اس عورت سے پوچھا۔

"رشید کا رشوت کے خلاف یہ احتجاج دوسرے پولیس والوں کو بالکل پسند نہیں تھا۔ ایک دن رشید نے دیکھا کہ ایک پولیس افسر نے بڑی خوبصورت وردی پہنی ہوئی ہے اور اس کے اوپر شیر کا نشان ہے۔ یہ نشان ملک کا نشان ہے۔ اس نے دل میں سوچا کہ کتنے خوش قسمت ہیں یہ لوگ ملک جنھیں اتنی عزت دیتا ہے۔ جب اس افسر نے ایک شخص سے دو صد روپے رشوت طلب کی تو رشید کو محسوس ہوا کہ یہ محاورہ غلط ہے کہ شیر بھوکا تو رہ سکتا ہے مگر گھاس نہیں کھا سکتا۔ وہ حیران ہوا۔ اس کا احتجاج بڑھتا ہی گیا۔ "یہ شخص تھانے میں ایک مصیبت ہے۔" ایک پولیس والے نے کہا اور باقی کے تمام لوگوں نے اس کی اس بات کی تائید کی۔

ایک صبح رشید نماز پڑھ کر تھانے کی طرف آ رہا تھا۔ اسے گاؤں کے دو نوجوان ملے۔ جن پر اگروادیوں کا آدھا اثر ہو چکا تھا۔ رشید انھیں سمجھانے لگا اور کہنے لگا:

"اگرواد غلط چیز ہے، پاپ ہے، گناہ ہے۔" تھانے دار نے رشید کو ان دو نوجوانوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا اس کے بعد رشید قید ہو گیا۔ اس پر ٹاڈا لگا دیا گیا اور اب وہ جموں جیل میں ہے۔ یہ ہے رشید کی کہانی۔"

"تو پھر سلیمان کے دوسرے لڑکے کا کیا ہوا؟"

"اچھا اچھا دوسرا بھائی اکبر" ——— عورت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا: "جس دن یہ واقعہ ہوا اکبر گھر میں نہیں تھا۔ وہ نوکری کی تلاش میں باہر گیا ہوا تھا۔ اس واقعہ کے چند ہی لمحوں بعد اکبر گھر کے اندر داخل ہوا۔ اُس نے بچہ کی لاش دیکھی اور پریشان ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر عجیب قسم کے آثار چڑھاؤ آئے۔ پھر اُس نے دیکھا کہ پٹھان باہر کھڑے ہیں۔ ایک پٹھان نے اکبر کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"چُپ رہو اکبر چُپ رہو۔ بچہ صرف تمھاری بہن ہی نہیں بلکہ سارے سماج کی بہن تھی۔"

اکبر نے اُس پٹھان کی طرف دیکھا ———

"بدلہ بدلہ، اکبر تمھاری بہن کا بدلہ لیا جائے گا۔"

میں چُپ رہی۔ کیونکہ پٹھان مجھے بھی گھور کر دیکھ رہے تھے۔

"تم بھی اُن کے ڈر سے سچ نہ کہہ سکی۔" عبدُل نے اُس عورت سے پوچھا۔

"نہیں بھیا یہ بات نہیں تھی۔ اگر میں سچ کہتی تو اکبر جذبات میں آ جاتا۔ اور وہ لوگ اکبر کو بھی مار دیتے۔" اُس عورت نے پھر بات آگے بڑھائی۔

"بدلہ بدلہ اکبر تمھاری بہن کا بدلہ لیا جائے گا۔" پٹھان نے اکبر سے کہا۔ رات کی سیاہی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے وہ لوگ آئے اور تمھاری بہن کی عزت لوٹ کر چلے گئے اور پھر اسے قتل بھی کر دیا۔" دوسرے پٹھان نے کہا:

"کون لوگ؟" اکبر نے پوچھا۔

"وہی ہندوستانی سپاہی" ——— یہ سُن کر عبدُل لال پیلا ہو گیا۔ اُسے لگا کہ تمام دُنیا اُس کی دُشمن ہے۔ یہ پہاڑ اُس کے دُشمن ہیں کیوں نہ انھیں کاٹ دیا جائے۔ اُس نے ڈل کے پانی کو ایک ہی گھونٹ میں نگلنے کی خواہش کی۔"

"اتنا ظُلم" ——— عبدُل کو لگا وہ عورت کہانی نہیں بلکہ مرثیہ سُنا رہی ہے۔ اُسے لگا کہ جہلم بہہ نہیں رہا ہے پھول کھل نہیں رہے ہیں، ہوا چل نہیں رہی ہے۔ بلکہ یہ سب مرثیہ سُنا رہے ہیں۔" انسان جب دُکھی ہوتا ہے تو شاعری کا سہارا لے لیتا ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایک ان پڑھ عورت کس طرح اس طریقے سے یہ کہانی سُناتی۔

"اکبر اپنے گھر کے اندر داخل ہوا اور گاندھی اور سُلیمان کی تصویروں کو توڑنے لگا۔ اُس کے اس کمرے کے اندر مختلف تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ کہیں گاندھی اور سلیمان اکٹھے کھانا کھاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں شیخ کو سلیمان ہار ڈال رہا تھا۔ کہیں تصویر میں نہرو شیخ کا سواگت کر رہا تھا۔ اور سلیمان ہار لے کر کھڑا تھا۔ پھر اکبر کو لگا کہ یہ تمام تصویریں شرمندہ ہیں۔ گویا کہہ رہی ہوں . . . " اکبر ہم شرمندہ ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمھاری بہن کی عزت اور زندگی نہ بچا سکے۔" اکبر نے غصے میں آکر اُن تصویروں کو توڑا پھر نئے کشمیر کے منشور کو تار تار کیا۔ اور اُس نے پھر شیخ کی تصویر کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا:

"اس لئے تم نے کشمیر کو ہندوستان کا حصّہ بنایا تھا!" . . . . اکبر وہاں سے بھاگ کر اگروادیوں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ ایک پٹھان نے اُس سے پوچھا:

"ٹریننگ پر کب جانا ہے۔"

"جب بھی سرحد کھل جائے گی۔"

"سرحد ہر وقت کھلی ہوئی رہتی ہے۔"

"کیوں؟ کیا سپاہی پہرہ نہیں دیتے۔" اکبر نے پوچھا۔

"سپاہیوں کے پہروں سے کبھی سرحدیں بند نہیں ہوتیں۔"

سرحدیں مضبوط ہوتی ہیں۔ لوگوں کے جذبوں سے خیر کوئی بات نہیں جس دن
بارش ہوگی سرحد پار کرا دی جائے گی۔ کیوں کہ یہاں پر زیادہ تر سپاہی باہر کے ہیں
اور مقامی پولیس سے کافی لوگ . . . "

وہ عورت جب یہ کہانی عبدل کو سنا رہی تھی تو عبدل کو لگ رہا تھا واقعات
اور حالات اُس کی زبان پر خود آگئے ہیں۔ نہ جانے وہ کون سی غیبی طاقت
تھی جس نے اُس عورت کو یہ ساری باتیں کہیں۔ جب وہ عورت بول رہی تھی تو
عبدل کو لگا کہ ہوائیں درخت سب اس حقیقت کو جانتے ہیں۔ وہ گھٹ گھٹ
کر مر رہے ہیں۔ اور اُس عورت کی زبان سے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں۔ ورنہ
ایک ان پڑھ عورت اور اتنی پختہ باتیں کرے۔

اُس عورت نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا ——————

" اکبر سرحد پار کرنے لگا۔ اُس نے دیکھا کہ سپاہی پہرہ دے رہے
ہیں۔ اُس کے رُوبرو ایک سپاہی کو گولی لگی اور وہ مر گیا ——————
اکبر کو خیال آیا۔ یہ سپاہی دیش کے لئے مرا ہے۔ کہاں کہاں سے لوگ اِن
سرحدوں پر اپنی جان دینے کے لئے آتے ہیں۔ دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ
ہوئی۔ یہ آواز سن کر اُس کی سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اُسے لگا کہ وہ اپنے ماضی سے الگ ہو
رہا ہے۔ پھر اکبر رینگ کر ایک طرف چلا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ ایک ایسا راستہ ضرور ہے جہاں سے
لوگ آجا سکتے ہیں۔ پھر اکبر اُس راستے کے ذریعے سرحد کے پار چلا گیا۔

اس عورت سے یہ کہانی یہاں تک سُننے کے بعد عبدل کی زبان خود بخود
بولنے لگی ——————

" یہ راستے کیوں نہیں بند ہو جاتے کون نہیں جانتا ہے یہ وہ راستے ہیں
جن پر چل کر لوگ بچہ کی عزت لوٹنے کے لئے آتے ہیں۔ جب پولیس کی
کھری میں رشوت چلتی ہے۔ تب ان راستوں کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔"
عورت نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا کہ:

" سُنا ہے پھر اکبر کو سرحد کے اُس پار ایک ٹرک کے اندر بٹھا کر لے جایا گیا۔
وہاں جا کر اکبر نے محسوس کیا کہ ہو سکتا ہے کہ تم نے اس کی بہن کی عزت لٹنے کے متعلق
غلط اطلاعات دی گئی ہو۔ کیونکہ سُنا ہے جس آدمی نے اکبر کو سرحد پار کرائی تھی اس کا
پٹھان کے ساتھ اس بات پر جھگڑا ہو گیا تھا کیونکہ طے تو بیس ہزار میں ہوئے تھے مگر
اُسے صرف دس ہزار روپے دیے گئے . . . کہانی سُنانے کے بعد عورت گھر کے اندر چلی گئی۔"

عبدل نے دیکھا کہ رات سیاہ ہے اور بارش بھی ہو رہی ہے وہ وہاں سے بھاگا۔ پھر
آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ سرحد کے اُس پار ضرور جائے گا۔ پھر سرحد کے
قریب پہنچ کر اُس نے وہ راستہ تلاش کر لیا جو بربادی کی طرف کشمیر کے نوجوانوں کو لے کر
گیا تھا۔ وہ راستہ یہاں کے حکمرانوں نے خود تیار کیا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ وہ جب
چاہیں گے اُسے بند کر دیں گے۔ مگر اُلٹا ہوا۔ راستے اُن سے آگے نکل گئے۔ سوراخ
اتنے بڑے ہو گئے کہ بند کرنے سے دیواریں ٹوٹنے کا خطرہ ہو گیا۔

پھر عبدل نے جان پر کھیل کر سرحد کو پار کیا۔ صُبح ہوئی مگر یوں لگا کہ صبح نہ ہوئی ہو۔
صرف سورج نکل رہا ہو۔ نہ مندر کے شنکھ کی آواز تھی اور نہ ہی اذان کی آواز۔ اس نے
محسوس کیا کہ شنکھ اور اذان ایک ہی آواز دیتے ہیں، ایک ہی پیغام دیتے ہیں اور وہ ہے
خدا ہی بڑا ہے وہ ہی یہاں ہے۔ عبدل دن بھر گھومتا رہا۔ لوگوں کو دیکھتا رہا۔ دوپہر کا
وقت ہو گیا۔ وہ ایک درخت کے نیچے سو گیا۔ شام ہو گئی۔ اُسے رات کا فکر ستانے
لگا۔ اُس نے ایک ٹیکسی والے کو آواز دی۔ ٹیکسی والا اُس کی آواز پر رُکا اور اس
سے کہنے لگا:

" فرمائیے صاحب!"

" مجھے کسی مسجد میں لے چلو۔"

"کیوں؟" ٹیکسی والے نے پوچھا۔
"مجھے رات گزارنی ہے۔" عبدل نے کہا۔
"رات گزارنی ہے تو کسی ہوٹل میں چلیے کیونکہ اب یہاں مسجدوں میں فوج آگئی ہے۔"
"تو پھر جمعے کی نماز لوگ کہاں پڑھتے ہیں۔" عبدل نے حیرانگی سے پوچھا۔
"یہ اسلامی ملک ہے۔ یہاں نماز پڑھنے کی بالکل ضرورت نہیں۔" ٹیکسی والے نے کہا اور پھر ٹیکسی تیزی سے چلانے لگا۔
عبدل یہ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ پھر اُسے بدری یاد آیا۔ بدری اُس کا دوست بدری، جس کے سنکھ کی آواز کے ساتھ ہی وہ نماز پڑھا کرتا تھا۔ عبدل نے ٹیکسی کی کھڑکی سے باہر دیکھا اُسے وہاں پر کچھ ٹینٹ لگے ہوئے نظر آئے۔

"یہاں کون لوگ رہتے ہیں اور یہ ٹینٹ کس کے ہیں؟"
"یہ کشمیریوں کے ہیں۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ایک عام سا جواب دیا۔
"کن کشمیریوں کے۔" عبدل نے سنجیدگی سے سوال پوچھا۔
"وہ ہی جو بھاگ کر یہاں پر آئے ہیں۔"
"مگر بھاگے کیوں؟"
"بے وقوف ہیں۔"
"جسے تم آزادی کی لڑائی کہتے ہو دُنیا کی نظر میں اس کی یہی قیمت ہے۔" عبدل نے اپنے آپ سے سوال کیا۔
"مگر جب سے یہ یہاں آئے ہیں نوجوانوں کا دل بہل گیا ہے۔"
"وہ کیسے؟" عبدل نے پوچھا۔
"یہ اپنے کپڑے کشمیر میں ہی چھوڑ آئے ہیں۔ . . . اور یہاں کے حکمران انھیں ایسے لباس دیتے ہیں جن سے اُن کی لڑکیوں کے بدن نظر آتے ہیں۔"

عبدل کو سُن کر یوں لگا جیسے وہ عبدل نہیں بلکہ انسانی جسم کے حصّوں کا مجموعہ ہو، جس کے ہاتھ پاؤں اور ٹانگیں ایک جگہ اکٹھے ہو گئے ہوں اور اُن سے وہ عبدل بن گیا ہو۔ عبدل کسی انسان کا نام نہیں ہے اُسے لگا۔ "مگر یہ تو اسلامی اصولوں کے خلاف ہے۔" عبدل نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ "مگر چونکہ یہ اسلامی ملک ہے اس لئے یہاں پر اسلام کے اصولوں پر چلنا ضروری نہیں ہے۔" عبدل نے اپنے آپ کو جواب دیا۔

"نہرو کشمیر ٹھیک کہا کرتے تھے: مسلمان تبھی مسلمان رہے گا جب ہندو۔" . . . عبدل نے پھر اپنے آپ سے کہا۔
"کچھ کہا آپ نے؟" ٹیکسی والے نے عبدل سے پوچھا۔
"کچھ نہیں۔ . . . اچھا ایسا کرو مجھے یہیں اُتار دو۔" ٹیکسی والے سے عبدل نے کہا۔
"تم چاہو تو میری ٹیکسی میں سو سکتے ہو۔" ٹیکسی والے نے عبدل سے کہا۔
عبدل نے اس کی بات مان لی اور رات کو وہیں پر سو گیا۔ صبح اُٹھا اپنے بیگ سے اس نے کرتا پاجامہ نکالا اور پہن کر آگے بڑھ گیا۔ سیدھا فوجی کیمپ میں چلا گیا۔ ہاتھ میں اس نے ایک فائیل اٹھائی ہوئی تھی۔
عبدل کو اب موت کا ڈر نہیں تھا اور نہ ہی تشدد کا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈا ضرور تھا مگر اس کی تاثیر گرم ہو گئی تھی۔ اب وہ نڈر ہو گیا تھا۔ اور جب انسان نڈر ہو جاتا ہے تو اُسے لگتا ہے کہ وہ پوری دُنیا کا بادشاہ ہے۔

عبدل سیدھا فوجی کیمپ کے کمانڈر سے ملا۔ . . . کمانڈر نے مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ . . . وہ کوئی نکالا گیا فوجی افسر دکھائی دیتا تھا۔ . . . اُس کے سامنے فائلیں پڑی ہوئی تھیں جن میں کشمیری لڑکوں کی تفصیل لکھی ہوئی تھی۔ . . . . . . جن میں یہ لکھا تھا کہ کتنے لڑکے مارے گئے، کتنے پکڑے گئے ہیں۔

کتنے مرنے کو تیار ہیں اور کتنے تیار ہو سکتے ہیں . . . عبدل نے سوچا۔

"اُف کشمیر کی تقدیر کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کہاں وہ فائلیں جن میں یہ لکھا جاتا تھا کہ کشمیر کے لڑکوں کی زندگی کیسے خوش حال ہو سکتی ہے۔ کہاں یہ فائلیں جن میں ان کی موت کے منصوبے درج ہیں۔ عبدل یہ بھی سمجھ گیا کہ نام تو اس کا ریفیوجی کیمپ ہے۔ مگر ہے یہ ٹریننگ کیمپ۔

عبدل نے کمانڈر کو سلام کیا۔ کمانڈر نے عبدل کے وہاں آنے کی وجہ پوچھی۔

"جناب میں پریس والا ہوں اور میرا نام عبدل ہے۔" یہ سنتے ہی کمانڈر نے گھنٹی بجائی اور چائے کا کپ منگوایا۔

"بتائیے کیا خدمت کر سکتا ہوں میں آپ کی۔" کمانڈر نے پوچھا۔

"مجھے اکبر نام کے لڑکے سے ملنا ہے۔" عبدل نے کہا۔

کمانڈر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا۔

"کیوں ملنا ہے آپ کو؟"

عبدل نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا . . . مجھے اکبر سے اس لیے ملنا ہے کیوں کہ اکبر کشمیر کا مستقبل ہے اور میں کشمیر کا ماضی ہوں اور حال درمیان سے تم لوگوں نے کاٹ دیا ہے۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔" کمانڈر نے کہا۔

"کوشش نہیں حضور کوئی تدبیر نکالیے۔"

"اصل میں یہ لوگ ٹریننگ میں اتنے مصروف ہیں کہ ان سے ملنا مشکل ہے۔"

"کوئی نہ کوئی تدبیر نکالیے۔" عبدل نے عاجزی سے کہا۔

کمانڈر نے یہ بات ابھی ختم ہی کی تھی کہ ایک نوجوان وہاں پر دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا پیچھا ایک پٹھان کر رہا تھا۔ نوجوان نے آتے ہی کہا:

"جناب یہ ظلم ہے۔" پٹھان نے اس کی پیٹھ پر مُکّہ مارتے ہوئے کہا:

"کیا ظلم ہے۔ تو کیا سمجھتا ہے آزادی تجھے تھالی پر رکھ کر دی جائے گی۔"

"کون سی آزادی جس آدمی نے مجھے یہاں پہنچایا چالیس ہزار روپیہ خود کھا گیا اور میرے ماں باپ کو اس نے دس ہزار روپے دیا۔

"نہیں بیٹا ایسی بات نہیں کرتے . . . ." کمانڈر نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر تم یہاں کیسے آئے۔" عبدل نے اُس سے پوچھا۔

"جب کسی قوم کا کوئی لیڈر نہیں رہتا تو وہ یتیم ہو جاتی ہے۔ اور یتیموں کا کیا ہے جو چاہے خرید لے اور جیسے چاہے استعمال کرے۔" یہ سُن کر عبدل ہکا بکا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا کمانڈر نے پٹھان سے مخاطب ہو کر کہا۔

"اسے تنگ مت کر جا بیٹا جا تو اس وقت جا۔ میں صبح خود کیمپ کا دورہ کروں گا . . ." یہ سنتے ہی وہ لڑکا اور پٹھان وہاں سے چلے گئے۔ ادھر عبدل نے بھی اپنا لب و لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔

"عجیب طریقوں سے آپ لوگوں کو پھنساتے ہیں۔"

"کیا کریں ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔"

اتنی دیر میں عبدل نے نظر پیچھے کی طرف دوڑائی۔ اس نے دیکھا کہ ایک پٹھان ایک کشمیری لڑکے کو اس طرح سے مار رہا ہے کہ لفظ ظلم بھی شرمندہ ہو گیا ہے۔ یہ سب کچھ عبدل سے برداشت نہ ہو سکا۔ مگر اس کے تجربے نے اُسے خاموش رہنے کا مشورہ دیا۔ اور عبدل خاموش رہا۔ خاموش رہنا عبدل کے اصول کے خلاف تھا۔ اسے لگا کہ ساری انسانیت خاموش ہو گئی ہے۔ وکیل، ڈاکٹر، سیاست دان سب خاموش ہیں۔

وہ پٹھان اس لڑکے کو لے کر اندر آ گیا۔ کمانڈر نے پوچھا "کیا ماجرا ہے کیوں مار رہے ہو اسے . . ." مگر پٹھان نے جواب دینے کے بجائے اس لڑکے کے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔

"یہ نہیں بتائے گا کہ یہ مجھے کیوں مار رہا ہے۔" لڑکے نے کہا۔ "اچھا تم ہی بتاؤ۔"
پٹھان نے لڑکے سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جناب میرے منہ سے لفظ نمسکار نکل گیا تھا۔"

"مگر یہ تو ہندو لفظ ہے اور اسلام کے خلاف ہے۔" کمانڈر نے عبدل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو بچوں کو خریدنا اسلام کے حق ہے۔ بھائی کو بھائی سے لڑانا اسلام کے اصولوں کے مطابق ہے۔" نوجوان نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اسلام انسانیت، محبت اور سچائی کا نام ہے اور یہ بھی اچھی طرح سن لو ایک سچا مسلمان ہی ہندو کو نمسکار کرتا ہے۔ ہندو کی بیٹی سے راکھی بندھوا سکتا ہے۔ پڑوسی کی حفاظت کر سکتا ہے۔"

یہ سن کر کمانڈر ہکا بکا رہ گیا اور پھر عبدل کی طرف دیکھنے لگا یوں لگ رہا تھا کہ کمانڈر کوئی گناہ کر رہا ہے اور اس گناہ کو عبدل سے چھپا رہا ہے۔ پھر اُس نے اشارہ کیا اور پٹھان اس لڑکے کو وہاں سے لے گیا۔

کمانڈر نے اپنی بات پھر شروع کی اور یوں ظاہر کیا جیسے یہ کوئی معمولی واقعہ ہو۔

"آپ تو اخبار نویس ہیں اور آپ سے کیا چھپانا ہے۔" کمانڈر نے کہا اور یوں محسوس کرایا جیسے اُس نے کوئی بہت بڑا کام کیا ہو۔ عبدل سمجھ گیا کہ کمانڈر چاہتا ہے کہ وہ جلدی یہاں سے چلا جائے۔ مگر عبدل بھی آخر عبدل تھا۔ وہ کب جانے والا تھا اس نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "بارڈر سیل ہے۔"

"بالکل درست فرمایا آپ نے۔" کمانڈر نے جواب دیا۔

"پھر نوجوان یہاں کیسے آئے۔" عبدل نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔

"اگر آپ سچائی جاننا چاہتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ فوج کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو وہ کبھی بھی بارڈر سیل نہیں کر سکتی۔"

"مگر پہلے تو لگتا تھا کہ بارڈر سیل ہے۔"

"بارڈر سیل کیا تھا ایک نعرے نے۔" کمانڈر نے کہا۔

"شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔"

"اچھا۔" عبدل نے کہا۔

"ہم نے وہ نعرہ ختم کر دیا۔ وہ جڑ ہی مٹا ڈالی جس پر اتحاد کا درخت قائم تھا۔ اس لیے لوگ آسانی سے ملی ٹینٹ بن گئے ہیں۔"

عبدل نے کمانڈر سے اجازت لی اور وہاں سے چل پڑا۔ کچھ دن تک عبدل ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ ٹیکسی والے نے سچ ہی کہا تھا کہ اسلامی ملک میں نماز پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ صبح کتنی دل کش ہوتی ہے جس میں مُلّاؤں کی اذان کے ساتھ ساتھ مندروں کی گھنٹیاں بھی بجتی ہیں اسے لگا کہ کوئی بھی دھرم کسی دوسرے دھرم میں رکاوٹ نہیں ہے۔ ایک کی پوجا دوسرے کی نماز میں مداخلت نہیں کرتی۔ ایک شام اس نے پھر ان کیمپوں کو دیکھا جن میں کشمیری لڑکوں کو ٹریننگ دی جاتی تھی۔ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ "کیمپ کیوں لگے ہیں۔ یہ لڑکے تو اسکول میں ہونے چاہیے۔ انھیں ریاضی، سائنس اور فلسفہ پڑھنا چاہیے۔ یہ موت کی ٹریننگ کیوں لے رہے ہیں۔ نفرت کا بیج تو ہتھیار بن کر ہی اُگے گا۔"

عبدل کے دل کے جذبے نے اُسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اچھائی کبھی ظلم برداشت نہیں کرنے دیتی۔ کسی کے ساتھ نفرت نہیں کرنے دیتی۔ بھوکے کے سامنے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھانے دیتی۔

ایک دن عبدل بھیس بدل کر ایک ٹریننگ کیمپ کے اندر چلا گیا۔ ایسا کرتے ہوئے اُسے یوں لگا کہ جیسے کسی غیبی طاقت نے اُس کی مدد کی۔ جب وہ کیمپ کے اندر داخل ہوا تو چاروں طرف سخت پہرہ تھا۔ کیمپ کے اندر اس پر کسی نے شک نہیں کیا۔ اندر ٹریننگ

کرنے والوں کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے جو مختلف جگہوں سے پیغام لاتے تھے۔ لہٰذا ضروری نہیں تھا کہ ہر کوئی ایک دوسرے کو جانتا ہو۔ اسی چیز کا عبدل نے فائدہ اُٹھایا۔ اُس کے پاس کھڑے ہوئے ایک شخص نے پوچھا:

"کہاں جا رہے ہو؟" عبدل گھبرا گیا۔ اور گھبراہٹ میں اُس نے پٹھان کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے میں پٹھان نے اُس سے کہا:

"آپ سے نہیں۔" گویا اُس کا کہنا تھا کہ وہ دوسرے پٹھان سے مخاطب ہوا ہے۔

"نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"

"نماز پڑھنا اتنا ضروری نہیں جتنا کہ یہ دکھانا ضروری ہے کہ تم نماز پڑھتے ہو۔" دوسرے پٹھان نے جواب دیا۔

"سچے لوگوں کو جلدی بے وقوف بنایا جا سکتا ہے۔" پہلے پٹھان نے پھر کہا:

"جس طرح سے کشمیریوں کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

عبدل نے دیکھا کہ ایک تیسرا پٹھان دو نوجوان لڑکوں کو ساتھ لے کر وہاں پر آیا۔ وہ دونوں لڑکے از حد خوبصورت تھے۔ ابھی لڑکپن و نوجوانی کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ اُن کی آنکھیں ڈل کی طرح گہری تھیں۔ بال محسوس ہوتا تھا جیسے نشاط و شالیمار کے پھولوں کے درختوں کی الھڑ ٹہنیاں ہوں معلوم ہوتا تھا کہ ماؤں نے بڑے ہی لاڈ پیار سے پالے ہیں۔ عبدل کو لگا کہ اُن دونوں کو یہاں پر قید کر کے لایا گیا ہے۔ دونوں چپ چاپ وہاں کھڑے تھے۔ عبدل نے انھیں دیکھا اور انھوں نے عبدل کی طرف دیکھا۔۔۔ لگا کہ وہ کشمیر کو بے بسی کے عالم میں دیکھ رہے ہیں۔ اور وہ ان کو بے بسی کے عالم میں دیکھ رہا ہے۔ عبدل نے چاہا کہ وہ اُنھیں گلے لگائے، چومے اور پھر اپنے گھروں کو واپس لوٹا دے۔

عبدل کو لگا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ بزدل ہے اور وہ سچا مسلمان نہیں ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ کیونکہ جو ظلم کو دیکھ کر چپ ہو جائے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

"حضور یہ دونوں مجاہد ہیں اور اسلام کے نام پر مر مٹنے کو تیار ہیں۔"

"دیر کس بات کی۔ ابھی سے ٹریننگ شروع کر دو۔" دوسرے پٹھان نے کہا۔

وہ پٹھان اُن نوجوانوں کو لے کر وہاں سے چلا گیا۔ عبدل یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اُسے لگا کہ ان دونوں نوجوانوں کو قتل گاہ کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ اور ساری دُنیا جانتے ہوئے بھی چپ ہے۔

اُن دو لڑکوں میں سے ایک نے کہا۔۔ "نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"

"پہلے نماز پڑھ لیں۔"

"ہاں کیوں نہیں۔ ٹریننگ لینے سے پہلے یہ ضروری ہے۔ اس سے تو اللہ بھی خوش ہو گا۔"

پٹھان نے اُس لڑکے کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا: یہ سُن کر وہ دونوں لڑکے وہاں سے نماز پڑھنے کے لئے چلے گئے اور پٹھان ان کو دیکھتے رہے۔

عبدل نے بھی یہ سب دیکھا ——— پھر اُسے شک ہوا کہ وہ ہے بھی کہ نہیں اُس نے اپنے آپ کو چھوا اور اپنے ہونے کا یقین کیا۔ پہلے پٹھان نے دوسرے سے کہا۔

"ایک بات کا خیال رکھنا بہادر۔"

"بولو۔" دوسرے نے کہا۔

"یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان ضرور کہیں مگر خیال رکھنا کہیں سچ مچ اسلام کے اصولوں پر نہ چل پڑیں۔"

"ایسا نہیں ہونے دیں گے۔" دوسرے پٹھان نے جواب دیا۔

"یہ بات بھی اچھی طرح سے جان لو کہ اگر یہ لوگ اسلام کے اصولوں پر چلیں گے تو پھر دہشت گرد نہ بن سکیں گے۔"

یہ سُن کر عبدل اور حیران ہو گیا اور پھر کیمپ کے اندر چلا گیا۔ کسی نے اس کو

ایک ایجنسی کا آدمی سمجھا اور کسی نے اُسے دوسری ایجنسی کا۔

اس چیز کا فائدہ اُٹھا کر وہ کیمپ کے اندر چلا گیا۔

اُس نے دیکھا کہ وہاں کشمیر کے نوجوانوں کو ٹریننگ دی جا رہی ہے۔ عبدل نے محسوس کیا کہ ٹریننگ دینے والے لڑکوں کو صرف ٹریننگ ہی نہیں دے رہے بلکہ اُن سے بدلہ لے رہے ہیں۔ ٹریننگ کا سہارا لے کر گالیاں دینا ایک معمول بن گیا ہے۔ اگر کہیں کوئی لڑکا غلطی کرتا تو اس کی ماں بہن کو ایک سخت گالی دی جاتی اور پھر اُسے تھپڑ بھی مار دیے جاتے۔ عبدل نے دیکھا اس ٹریننگ کا سہارا لے کر ان پر طرح طرح کے ظلم کیے جا رہے ہیں اور آزادی کی تحریک کے نام پر یہ کیمپ بدترین غلامی کی مثال پیش کرتے ہیں۔ عبدل کے سامنے ہی ایک پٹھان نے کشمیری لڑکوں کو خطاب کرنا شروع کر دیا۔

"ہندو ہماری مسجدوں کو گرا رہے ہیں، مسلمان لڑکیوں پر ظلم کر رہے ہیں۔"

ایک لڑکا کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔

"ایک سوال۔"

"کیا نام ہے تمھارا؟" پٹھان نے پوچھا۔

"اکبر۔" لڑکے نے جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟" پٹھان نے پھر پوچھا۔

"نوا ٹی پورہ کا۔"

عبدل سمجھ گیا کہ یہ اکبر کوئی دوسرا نہیں بلکہ سلیمان کا ہی پوتا ہے۔

"یہ وقت سوال کرنے کا نہیں بلکہ کام کرنے کا ہے۔" یہ کہہ کر پٹھان نے پھر اپنا لیکچر جاری کر دیا۔

"تو میں کہہ رہا تھا... ہندوستان میں مسلمانوں کو دھوتی پہننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ نماز نہیں پڑھنے دی جاتی..." یہ سُن کر اکبر پھر کھڑا ہو گیا۔ اس

نے کہا:

"جناب!"

"پٹھان اُٹھا اور اُس نے اکبر کے مُنہ پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا:

"حرامزادے ٹریننگ کے دوران بکواس کرتا ہے۔" پٹھان نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ہندوستان میں مسلمان نمبر ۲ کے شہری ہیں اور وہاں پر اُنھیں تنگ کیا جا رہا ہے۔" اکبر سے رہا نہ گیا اور اس نے پھر بولنے کی کوشش کی۔ اب کی بار پٹھان نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر اس نے دوبارہ سوال پوچھنے کی کوشش کی تو وہ اُسے جان سے مار ڈالے گا۔ اس نے کشمیری لڑکوں سے کہا کہ وہ سرحد پار کرتے ہی پلوں کو اُڑا دیں... اسپتالوں کو جلا دیں اور مندروں میں بم رکھیں۔

اکبر سے پھر رہا نہ گیا۔ وہ احتجاج میں اُٹھا۔ اُسے لگا کہ کوئی چیز اُسے آرام سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ اُسے تنگ کرتی ہے۔ مگر عبدل سمجھ گیا تھا کہ سلیمان کا لہو ہے جو کہ اکبر کی رگوں میں دوڑ رہا ہے اُسے چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا انجام موت ہو سکتا ہے۔ اکبر نے کہا:

"یہ سب اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے۔" یہ سُن کر پٹھان کانپنے لگا۔ عبدل کو یاد آیا کہ سلیمان کی بیچ کی آواز سُن کر بھی پٹھان اس طرح کانپا کرتے تھے۔ حالانکہ ان کے پاس بڑے بڑے ہتھیار ہوا کرتے تھے۔ خونخوار ہتھیار اور عبدل کے پاس صرف ایک نعرہ تھا:

"شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مُسلم سِکھ اتحاد۔"

"تیری بہن کی عزت جو ہندوستانی سپاہیوں نے لُوٹی ہے۔"

"مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے اور دُکھ ہندوؤں کے ان لیڈروں پر بھی ہے جو جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔" پٹھان نے اکبر کو گھور کے دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

"اور یہ بھی جھوٹا پرچار ہے کہ ہندوستان میں مسلمان نمبر دو کے شہری ہیں۔ اسی طرح سے یہ بھی بالکل غلط ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو نماز نہیں پڑھنے دی جاتی۔"

اکبر کی یہ بات سُن کر پٹھان غصے میں آگیا۔

"انسان جب سچائی کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو غصے میں آتا ہے اور پھر غصے میں آکر جھوٹ بولتا ہے۔" پٹھان نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"تمھیں غیرت نہیں تمھاری بہن کی عزت۔" . . . "یہ پرچار بھی اسی طریقے سے جھوٹا ہے جس طریقے سے یہ پرچار جھوٹا ہے کہ ہندوستان میں اسلام محفوظ نہیں ہے۔"

یہ سنتے ہی پٹھان نے اکبر کو لاتوں اور مکّوں سے مارنا شروع کر دیا۔ تمام لوگ اس جبر کو دیکھ رہے تھے۔ عبدل بھی اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ عبدل کو لگا کہ کشمیر کو لاتوں اور مکّوں سے مارا جا رہا ہے۔ اور ساری دُنیا خاموش ہے۔ اکبر نے یہ جانتے ہوئے بھی احتجاج نہیں کیا کہ اس کے احتجاج کی کوئی قیمت نہیں۔ مار کھاتا گیا اس نے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔ پٹھان اسے اور مارنے لگا۔ پٹھان کو بھی اس بات کا غصہ تھا کہ اکبر اس کے ظلم کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتا یا اس سے معافی کیوں نہیں مانگتا۔ پھر پٹھان نے اکبر کے منہ پر ڈنڈا مارا اور اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

عبدل کو لگا کہ کشمیر کے منہ سے خون بہہ رہا ہے اور لہو کے اس دریا میں لوگ ظلم کی کشتیاں چلا رہے ہیں۔ اُس کے بعد جب پٹھان تھک گیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اکبر جیت گیا۔ اور وہ ہار گیا ہے۔ اسی شکست کو چھپانے کے لئے پٹھان نے اکبر کو ایک قید خانے میں بند کر دیا۔

اکبر نے دیکھا کہ اُس قید خانے کے اندر کافی نوجوان بند ہیں۔ اُسے لگا کہ کشمیر کا نصیب بند ہے۔ ایک لڑکے نے اُسے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا:

"تم اکبر ہو۔"

"ہاں بھائی بدنصیب اکبر ہی ہوں۔"

"بدنصیب اکبر نہیں بلکہ بدنصیب کشمیری کہو . . . ۔" دُوسرے لڑکے نے جواب دیا۔

"سُرنگ بنا رہے ہیں۔" لڑکے نے سرگوشی کی۔

"مگر سارا کام طریقے سے کرنا ہوگا۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"نہیں ابھی تھوڑا کام باقی ہے۔" تیسرے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

"تین طریقوں سے نوجوانوں کو یہاں پر لایا جاتا ہے . . . ۔" اکبر نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

"پہلے وہ جو پیسے کے لالچ میں آتے ہیں۔ دُوسرے وہ جو حکمرانی سے تنگ ہو کر آتے ہیں۔ اور تیسرے وہ بدنصیب جو اسلام کے نام پر لائے جاتے ہیں۔" . . . . اکبر نے اپنی بات ابھی ختم کی ہی تھی کہ ایک پٹھان وہاں پر آگیا . . . . اور آتے ہی اُس نے کہا:

"تمام لوگ مُرغا بنو۔" یہ سُن کر تمام لڑکوں نے ایسا ہی کیا۔

عبدُل ایک کھڑکی کے سوراخ سے یہ سارا نظارہ دیکھ رہا تھا۔ پھر اُس نے شیرِ کشمیر کی وہ تقریر بھی یاد کی جس میں اُنھوں نے کہا تھا کہ وہ کشمیریوں کو چاند اور ستاروں کی طرح چمکتا ہو دیکھنا چاہتے ہیں اور انھوں نے کہا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ کشمیر کے لوگ آسمان کی بلندیوں کو چھوئیں۔

عبدُل تنگ آکر ساتھ والے کیمپوں کے اندر چلا گیا۔ چونکہ یہ کیمپ بھی پہلے کیمپ کا ہی ایک حصّہ تھا۔ اس لیے عبدُل کو کوئی خاص مشکل پیش نہیں آئی۔ عبدُل نے دیکھا کہ ایک پٹھان کشمیری لڑکوں کو ایک نقشہ دکھاتے ہوئے سمجھا رہا تھا کہ کس طرح وہ لوگ مندر میں بم رکھیں گے۔ پھر بم پھٹے گا لوگ زخمی ہوں گے اور مسجد پر وار کریں گے۔ اور اُس سے وہاں پر ایک بہت بڑا

فساد ہوگا۔

ایک کشمیری لڑکے نے پوچھا :

"جناب اگر فساد نہ ہوا تو . . ."

"وہ انتظام ہم نے کر دیا ہے۔ ہمارے ہی کچھ آدمی مسجد پر حملہ کر دیں گے۔"
دوسرے پٹھان نے جواب دیا۔

"حضور مسجد پر حملہ کرنے سے ہماری تحریک پر کوئی فرق تو نہیں پڑے گا۔"

"وہ جہنم میں جائے تمھاری تحریک آزادی ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں اور ایک بات اچھی طرح سن لو، ہمیں کشمیریوں سے غرض نہیں، ہمیں صرف کشمیر سے مطلب ہے۔"

یہ بات سن کر کشمیری لڑکے حیران ہو گئے۔ اتنے میں ایک دوسرا پٹھان دوڑتا ہوا وہاں پر آیا اور آتے ہی کہنے لگا :

"حضور زمین کے نیچے سے ٹھک ٹھک کی آواز آرہی ہے۔"

کمانڈر نے گھبرا کر کہا : "لگتا ہے دال میں ضرور کچھ کالا ہے"۔ "جلدی چلو" دوسرے پٹھان نے کہا۔

وہ تمام لوگ جہاں سے ٹھک ٹھک کی آواز آرہی تھی اُس طرف چل پڑے۔ وہ اتنے گھبرا گئے کہ انھیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ عبدل ان کے ساتھ چل رہا ہے۔ عبدل نے اپنے آپ سے کہا کہ اگر ایک ٹھک ٹھک کی آواز سننے سے ان لوگوں کے ہوش و حواس اُڑ گئے تو اُس دھرتی کا کیا ہوگا جہاں برسوں سے ٹھک ٹھک کی آوازیں آرہی ہیں۔ عبدل گھبرایا اُسے لگا کہ شاید اُسے کوئی مار نہ دے۔ مگر پھر اُسے لگا کہ وہ تو زندگی اور موت کی حد سے کافی آگے نکل چکا ہے۔

سُرنگ کے اندر سے آہستہ آہستہ آواز آرہی تھی . . . "ٹھک ٹھک"۔ عبدل کو لگا کہ یہ ٹھک ٹھک نہیں بلکہ کوئی کہہ رہا ہے :

"کھولو کھولو۔"

پھر اُس نے محسوس کیا . . . کہ کشمیر ایک سُرنگ ہے اُس کے اندر سلیمان کی رُوح قید ہے اور وہ کہہ رہی ہے . . . "کھولو کھولو۔"

پٹھانوں کو اُدھر آتے دیکھ کر اکبر نے اشارہ کیا۔ پھر ٹھک ٹھک کی آواز بند ہو گئی۔ اکبر سُرنگ کے باہر کھڑا تھا۔ اُس نے پہلے ہی ایک پتھر سے اُس سُرنگ کو بند کر دیا تھا۔

پٹھان کمانڈر نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے اکبر سے پوچھا :

"یہ ٹھک ٹھک کی آواز کہاں سے آرہی تھی۔"

"کون سی آواز ؟"

"یہی آواز جو ابھی ہم سُن رہے تھے۔"

"یہاں تو کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔" اکبر نے کہا۔

پھر کمانڈر نے اپنی نظریں چاروں طرف دوڑائیں اور جانے کی تیاری کرنے لگا۔

اُدھر سُرنگ کے اندر ایک لڑکے کو کھانسی لگی۔ اُس نے دوسرے سے کہا :

"میرا گلہ دباؤ۔ دوسرے نے اُس کا گلہ دبانے کی کوشش کی۔ مگر کھانسنے کی آواز بند نہ ہو سکی۔ پھر اُس نے ایک تیسرے لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا :

"میرا گلہ زور سے دباؤ۔" تیسرے لڑکے نے اُس کا گلہ زور سے دبایا پہلے لڑکے نے پانی کا اشارہ کیا مگر پانی وہاں پر نہیں تھا۔ وہ لڑکا مرنے لگا۔ ڈل پانی سے بھری ہوئی تھی۔ کشمیر کے جھرنے چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ پوری زمین کے ایک دو گز کے نیچے پانی تھا۔ وہ پانی کشمیر کا تھا۔ وہ لڑکا بھی کشمیر کا تھا، مگر سچائی یہ ہے کہ دو بوند پانی بھی نہ مل سکا۔ اور وہ لڑکا مر گیا۔

اُدھر جس لڑکے نے گلہ دبایا ہوا تھا اس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی۔

کمانڈر نے وہ چیخ سُن لی۔ پٹھان کمانڈر نے چیخ کی آواز سُنتے ہی سٹرنگ پر رکھا ہوا پتھر اُٹھا دیا۔ اُس نے دیکھا کہ اندر لڑکے سٹرنگ نکال رہے ہیں۔ پٹھان نے غصے میں آکر دو تین لڑکوں کو گولی مار دی۔ گولی چلانا ایک معمولی بات تھی اس پٹھان کے لیے۔ عبدل کو لگا جس طرح پٹھان روٹی کھاتا ہے، کپڑے پہنتا ہے گالی دیتا ہے اسی طریقے سے کشمیری لڑکوں کو گولی مار رہا ہے۔

پھر اُس پٹھان نے اکبر کو مارنا شروع کر دیا۔

"اسے جان سے مت ماریئے۔" دوسرے پٹھان نے اُس سے کہا۔

"مگر کیوں؟"

"اسے آسانی سے نہیں مارا جائے کیونکہ سارے مسئلے کی جڑ یہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" پہلے پٹھان نے کہا۔

عبدل کو لگا کہ وہ پٹھان کشمیر کو مارنا چاہتے ہیں۔ مگر اُن کے مطابق کشمیر کو آسانی سے مرنے کا بھی حق نہیں ہے

پٹھان نے اکبر کو بڑی بے رحمی سے باندھا۔ یوں لگا جیسے وہ کسی پاگل گئے کو باندھ رہا ہو۔ پھر اکبر کا مُنہ ایک پُرانے کپڑے سے بند کر دیا۔ اتنی دیر میں پٹھان کمانڈر آیا اور اس نے اکبر سے کہا:

"جو لڑکے یہاں ٹریننگ کرنے کے لئے آتے ہیں انھیں اچھی طرح سے سمجھا لو کہ اگر کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اس کے رشتہ دار جو سرحد کے اُس پار رہتے ہیں قتل کر دیے جائیں گے۔"

اکبر چُپ چاپ اُسے دیکھتا رہا۔ ادھر عبدل کو لگا کہ اکبر کا نہیں بلکہ کشمیر کا مُنہ بند کر دیا گیا ہے۔ کشمیر دیکھ سکتا ہے مگر بول نہیں سکتا۔

عبدل کیمپ سے باہر آگیا۔ پھر ایک دوسرے گاؤں میں چلا گیا۔ رات اُس نے فقیر بن کر وہاں گزاری۔ دوسرے دن ایک دریا کے بہاؤ کے خلاف اُس نے چلنا شروع کر دیا۔ ایک فوجی نے پوچھا:

"کون ہو تم؟"

"عبدل ہوں اور یہاں کا رہنے والا ہوں۔" عبدل نے جواب دیا۔

"کہاں جا رہے ہو۔"

"یوں ہی گھوم رہا ہوں، دریا دیکھ رہا ہوں۔" فوجی نے عبدل کی تلاشی لی۔ اور اُسے جانے دیا۔ پھر عبدل نے دریا کی مخالف سمت چلنا جاری رکھا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ اس نے سرحد پار کر لی ہے۔ اس لئے نہیں کہ کہیں خدا نے لکھا تھا کہ اب تم دوسرے مُلک میں ہو۔ یا اس لئے نہیں۔ جانے کہا کہ راستہ بدل رہے ہو۔ اس لئے بھی نہیں کہ پانی کا ذائقہ بدل گیا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ اب کی بار جو فوجی اس نے دیکھے ان کی وردی کا رنگ دوسرا تھا۔ پھر ایک ملٹری گاڑی میں بیٹھ کر عبدل سری نگر شہر میں آگیا۔ شکست خوردہ عبدل پریشان دکھائی دے رہا تھا اسے لگا کہ وہ کوئی مقابلہ ہار گیا ہے اور یہ لڑائی ایک ایسی لڑائی ہے جسے کوئی جیت نہیں سکتا۔

پھر اس نے اخبار اُٹھایا اور پڑھنے لگا۔ ایک سُرخی تھی:

"دس اُگروادیوں اور دو پولیس والوں کو ملا کر پندرہ آدمی مرے،" مگر یہ مرنے والے تین آدمی کون ہیں۔ عبدل کی سمجھ سے یہ باہر تھا بلکہ یوں لگ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کشمیر کی سمجھ سے بھی باہر ہے۔

ایک دوسرے اخبار کی سُرخی عبدل نے پڑھی:

اُگروادیوں نے تین پُل جلا دیے . . ." ان خبروں کو پڑھ کر عبدل اور پریشان ہو گیا۔

ایک بار تیرہ برس کا لڑکا وہاں دوڑتا ہوا آیا جو کہ زخمی تھا اور جس کی ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا مگر کوئی اُس سے اُس کا سبب پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ یا ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔ عبدل کو لگا کہ لوگ جینے کے لئے مجبور ہیں۔ ورنہ

ان میں خواہش نہیں ہے۔ وہ لڑکا بھی کسی کو مدد کے لئے نہیں پکارا۔ جیسے کہ اسے معلوم ہو کہ یہ لوگ انسانی لہو اور جہلم میں بہتے ہوئے پانی میں کچھ فرق نہیں سمجھتے۔

عبدل نے اس لڑکے سے پوچھا:

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"کبھی میرا نام افضل تھا مگر اب میرا کوئی نام نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"اب میں صرف ایک ملی ٹینٹ ہوں اور ملی ٹینٹ کا کوئی نام نہیں ہوتا۔"

"کیا ہوا ہے تمھیں۔" عبدل نے پھر اس سے پوچھا:

"مجھے سیکورٹی فورسز والوں نے گولی مار دی۔"

"کیوں۔"

"کیونکہ میں آزادی کی لڑائی لڑ رہا ہوں۔" عبدل نے اپنی پگڑی اتار کر اس کی ٹانگ پر پٹی باندھ دی، لیکن لہو بند نہ ہوا۔ عبدل کو لگا کشمیر بھی اپنا نام اس لڑکے کی طرح کھو چکا ہے۔

"تم کون سی آزادی کی لڑائی لڑ رہے ہو۔" عبدل نے پھر اس نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کی ٹانگ سے بہنے والا لہو بند ہو گیا۔

"یہ لڑائی سب لوگ لڑ رہے ہیں۔"

"مگر کس کے خلاف۔"

"یہ معلوم نہیں۔" وہ لڑکا لنگڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ عبدل دور تک اسے دیکھتا رہا۔ پریشانی کے عالم میں عبدل اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر مٹی پر پتھروں کے ذریعے لکھنے لگا۔

"شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔"

پھر لکھتا ہی گیا۔ اس کے گرد گاؤں کے کچھ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ پھر ان کو دیکھ کر عبدل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ عبدل انھیں اتنا مظلوم لگا کہ اسے دیکھ کر

سب پریشان ہو گئے۔ انھیں عبدل پر رحم آیا۔ اس کی داڑھی کھلی ہوئی تھی۔ سر ننگا تھا کیونکہ اپنی پگڑی اس نے کشمیر کے مستقبل کے بدن سے بہنے والے لہو کو بند کرنے کے لئے استعمال کی تھی۔ لوگوں کو لگا کہ عبدل کے اس غم میں خیار کے بچے بھی شامل ہیں۔ اس کے ماتھے کی جھریاں ظاہر کر رہی تھیں کہ عبدل بھوکا ہے۔

"یہ مر جائے گا۔" ایک شخص نے دوسرے سے کہا:

"اگر ایسا ہوا تو اللہ کا قہر ہم پر نازل ہو گا۔" دوسرے نے جواب دیا۔

اتنے میں ایک شخص گھر سے کھانا لے کر آیا اور عبدل کو کہنے لگا۔

"کھانا کھا لو بھائی، کھانا کھا لو۔" عبدل چپ چاپ اسے دیکھتا رہا پھر اس نے مٹی پر پتھروں سے لکھنا شروع کر دیا:

"شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔"

"اب تو یہ پانی بھی نہیں پیتا۔" ایک بندوق بردار لڑکا وہاں پر آیا اور عبدل کو دیکھ کر کہنے لگا:

"اسے تو مارنے کا دل بھی نہیں کرتا۔"

"اچھا اس سے پوچھو یہ چاہتا کیا ہے۔"

"تم کیا چاہتے ہو۔" ایک شخص نے اس سے پوچھا۔

پھر دوسرے نے پوچھا، پھر تیسرے نے۔ عبدل نے کہا:

"جو میں کہتا ہوں کرو گے۔"

"کریں گے اور ضرور کریں گے۔" لوگوں نے کہا۔

"تو جو میں نے زمین پر لکھا ہے اسے پڑھو۔" لوگ پڑھنے لگے:

"شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔"

"پھر پڑھو۔" عبدل نے کہا۔ لوگوں نے اسے پھر پڑھا۔

"شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد۔" سب اسے لگاتار پڑھنے لگے۔

محسوس ہوا کہ لوگ واپس اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں اور موسموں میں کوئی رنگ بھر رہا ہے۔ چنار کے پتے ہلنے لگے۔ لگا کہ وہ بھی یہ نعرہ لگا رہے ہوں۔ اس نعرے نے پھر لوگوں کے اندر ایک جذبہ بیدار کیا۔

ایک عورت ڈرتی ہوئی آئی اور عبدل سے کہنے لگی۔

"میں بول سکتی ہوں۔"

"بولو، بولو۔" عبدل نے کہا۔

"افسوس کہ اس بستی کا ہر شخص چپ ہے۔"

"وہ کیوں۔" عبدل نے پوچھا۔ اس عورت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"بلکہ یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا کہ چپ نہیں بلکہ بزدل ہے۔" "مسلمان ہو کر بزدل، میں تو یہ کہوں گا کہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ کیونکہ مسلمان اور بزدل یہ دونوں متضاد باتیں ہیں۔" عبدل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

شیر کشمیر زندہ باد کا نعرہ لگانے کے بعد لوگوں میں بات کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔ ایک شخص نے کہا۔

"میرا بیٹا زبردستی سرحد پر لے جایا گیا۔"

"پچھلے پانچ برسوں سے بچے جوان ہو رہے ہیں اور قتل ہو رہے ہیں۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"اس کے خلاف جہاد کرو۔" عبدل نے اُن سے کہا۔

"عسکریت پسند کچھ بھی کرنے نہیں دیتے۔" تیسرے شخص نے کہا۔

"مگر یہ عسکریت پسند ہیں کون۔" عبدل نے لوگوں سے سوال کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

"ایک کا بیٹا دوسرے کا بھائی تیسرے کا ہمسایہ۔"

"نہیں کچھ لوگ باہر سے بھی آئے ہیں۔" ایک شخص نے کہا۔

"وہ کیسے۔" عبدل نے پوچھا۔

"سرحدیں کمزور ہیں۔" اس شخص نے جواب دیا۔

"سرحدیں مضبوط جذبوں سے ہوتی ہیں اور وہ جذبے تم لوگوں نے ختم کر دیے ہیں۔ ان کا گلا گھونٹ دیا ہے۔"

"پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے یہ سب کچھ کیوں ہونے دیا۔" دوسرے شخص نے پھر سوال کیا۔

"یہ سوال اپنے آپ سے پوچھو۔" "یہ سب اس لئے ہوا کیونکہ یہاں پر الیکشن میں بے ایمانی ہوئی۔"

"اگر وہ بے ایمانی ہوئی ہے تو کس نے کی۔" عبدل نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔

"ایسا اس لئے ہوا کیونکہ ہندوستان کی حکومت نے کشمیریوں کے ساتھ امتیاز کیا۔"

"مگر تم تو خود ہی ہندوستان کی حکومت ہو۔" عبدل نے اُس شخص کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

جب کسی سے کوئی جواب نہ بن سکا تو ایک شخص نے عبدل سے پوچھا: "تم ہی بتاؤ ایسا کیوں ہوا؟"

"ایسا اس لیے ہوا کیونکہ تم لوگوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی۔ زکات دینی چھوڑ دی۔ کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ جو خود نماز نہیں پڑھتا وہی دوسرے کی پوجا پر اعتراض کرتا ہے۔"

تمام لوگ عبدل کو حیرانی سے دیکھنے لگے۔ دل ہی دل میں انھوں نے سوچا اور پھر محسوس بھی کیا کہ عبدل نہیں بلکہ وہ تمام لوگ خود بول رہے ہیں اور سچ بول رہے ہیں۔ عبدل پھر بولنے لگا۔ پھر محسوس ہوا کہ لوگ بول رہے ہیں۔ اب کی بار لگا کہ لفظ ان کے ہونٹوں سے بولنے لگے ہیں اور روشنی ان کی آنکھوں سے دکھنے لگی ہے جب انسان سچ بولتا ہے اُس کا سارا لہجہ ہی بدل جاتا ہے جن

ہونٹوں سے سچ نکلتا ہے۔ لفظ اُن پر فخر کرتے ہیں جو آنکھیں سچ دیکھتی ہیں۔ موسم ان کے عاشق ہو جاتے ہیں اور اس وقت لگتا ہے جیسے اندھیرا خود ہی روشنی ہو جائے۔

"اچھا یہ بتا بدری اس گاؤں سے کیوں گیا؟" عبدل نے پوچھا۔ سب لوگ ایک دوسرے کو حیرانی سے دیکھنے لگے۔ پھر ایک شخص نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"وہ اپنی مرضی سے گیا ہے۔" دوسرے نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ . . "وہ وہاں عیش کر رہا ہے۔ اُسے ہزاروں روپے کی مدد مل رہی ہے . . ." چوتھے شخص نے کہا۔

عبدل نے ان تمام لوگوں کو حیرانی سے دیکھا۔ پھر غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔ مگر اُسے لگا کہ وہ بے بس ہے۔

"میں خود جموں جا کر دیکھتا ہوں کہ بدری کیا کر رہا ہے۔" عبدل نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔

"پہلے میں یہاں کے کچھ لیڈروں سے تو مل لوں۔" یہ کہہ کر عبدل وہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر سری نگر چلا گیا۔ وہاں محلّوں و گلیوں میں گھومنے لگا۔ پھر ایک محلّے کے اندر جا کر پرانے مکانوں کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے ایک دروازہ کھٹکھٹایا۔ اتنی دیر میں گھر کا نوکر گھر سے باہر آیا اور اس نے بدتمیزی سے عبدل سے کہا۔

"بوڑھے۔"

"ہاں بھائی بوڑھا ہی تو ہوں۔" عبدل نے اس نوجوان کو جواب دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھتے نہیں بھائی اُگرواد ہے۔"

"اُگرواد کہتا ہے کہ انسانی تہذیب چھوڑ دو۔" یہ سن کر نوکر نے کُتّا کھول دیا۔ جسے دیکھ کر عبدل بھاگا اور عبدل کے پیچھے کُتّا بھی بھاگا۔ عبدل نے سوچا کہ اُگرواد کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیر میں ہی کشمیری روایات بھی ختم ہو گئی ہیں۔

عبدل کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک گھر کے پاس رُکا اور اُس نے اس گھر کو

پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ پھر پریشان ہوا۔ اچانک اُس کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ اُسے لگا کہ اس کی کھوئی ہوئی دولت اُسے واپس مل گئی ہو۔ اچانک آواز دینے لگا۔

"آفاق صاحب، آفاق صاحب،" مگر نہ ہی کسی نے دروازہ کھولا اور نہ ہی کسی نے اسے خوش آمدید کہا۔

اُس نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ کیا اُگرواد یہاں پر کشمیری تہذیب کی جگہ آیا ہے۔ کشمیر کی مہمان نوازی کا کیا ہوا۔ پھر اچانک گھر کے نوکر کی آواز نے عبدل کو چونکا دیا جس نے صرف اتنا کہا:

"آفاق صاحب تو انگلینڈ چلے گئے ہیں۔"

"مگر کیوں؟" عبدل نے پوچھا۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں ہو گا کہ یہاں اُگرواد پھیلا ہوا ہے۔" نوکر نے طنز کرتے ہوئے کہا اور پھر اس نے زور سے دروازہ بند کیا۔ عبدل کو لگا کہ کشمیر کی ترقی کا دروازہ بھی اسی طریقے سے بند ہو گیا ہے۔

مگر اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ اور ایک پرانے دوست کے گھر کو یاد کیا۔ اس نے اور وہاں پر چلا گیا۔ اُس نے پھر آواز دی:

"گون صاحب، گون صاحب۔" یہ آواز سن کر اندر سے ایک عورت باہر آئی اور عبدل سے بولنے لگی۔

"کون ہیں آپ۔"

"گون صاحب کہاں ہیں۔" عبدل نے اُس عورت سے سوالیہ لہجے میں بات کی۔

"نہیں بیٹے بتایئے آپ کون ہیں۔" عورت نے پھر عبدل سے پوچھا۔

عبدل سمجھ گیا کہ یہاں پر سارا ماحول شک کا ہے۔ کوئی کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔ یہی شک وجہ ہے بربادی کی۔ پولیس شک کی وجہ سے لوگوں کی تلاشی لیتی ہے اور لوگوں کو شک ہے کہ پولیس اُنھیں تنگ کرتی ہے۔ لگتا ہے کہ ہر شخص شک کی زندگی جی رہا ہے۔ ڈل کو اپنے ہونے پر شک ہے۔ جہلم کو اپنے بہنے پر شک ہے اور محسوس

ہوتا ہے کہ چنار کے پتے ہوا کے ساتھ ہل نہ رہے ہوں بلکہ تسک کر رہے ہوں اور یہی تسک کشمیر کی تباہی کی وجہ ہے۔ اُس نے سوچا کہ کاش شیرِ کشمیر زندہ ہوتے تو لوگوں کا یقین شک میں نہ بدلتا۔ یہاں کون ہے جس پر کوئی اعتبار کرے۔

"آپ کس سوچ میں ڈوب گئے ہیں؟" اُس عورت نے پھر عبدل سے پوچھا۔

"میرا نام عبدل ہے اور میں نواں پورہ کا رہنے والا ہوں۔" "عبدل" یہ لفظ سُن کر وہ عورت چونک گئی "عبدل یہ نام تو تاریخ میں بہت بار پڑھا ہے۔ مگر آپ تو سو گئے تھے۔"

"مگر وقت اور حالات نے پھر مجھے جگا دیا۔" عبدل نے جواب دیا۔

"وہ گون صاحب تو قید میں۔" اُس عورت نے عبدل کے پہلے سوال کا جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" عبدل نے پوچھا۔

"کیوں کہ وہ لوگ اس تحریک کی حمایت کرتے تھے اس لئے حکومت نے انھیں قید کیا ہے۔"

"میں ابھی دہلی جاکر بات کرتا ہوں۔ اگر نہرو اور گاندھی آج وہاں پر نہیں ہیں تو کیا ہوا میرے اور چاہنے والے زندہ ہیں۔"

"نہیں بھائی صاحب! ایسا ظلم مت کیجیے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" عبدل نے حیرانگی سے اُس عورت سے کہا۔

"اگر وہ باہر آئیں گے تو گرودادی انھیں گولی مار دیں گے۔"

"مگر کیوں؟"

"یہ ایک عجیب داستان ہے۔" یہ کہہ کر وہ عورت رونے لگی۔

"سُناؤ بہن سُناؤ یہ داستان مجھے بھی سُناؤ۔" عورت نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"سچ بولنے سے مت ڈرو اور یہی سُن لو کہ جو قوم سچ بولنے سے ڈرتی ہے وہ مرجاتی ہے۔" عورت نے بات شروع کی:

"انھوں نے لوگوں کو بھڑکانے کے لئے تقریریں کیں صرف یہ سمجھ کر کہ اس

طریقے سے ووٹ زیادہ ملتے ہیں۔" عورت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اندر جانے کا راستہ سب جانتے ہیں۔ مگر باہر آنے کا کسی کو معلوم نہیں اور سب لوگ دلدل میں پھنس گئے ہیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں، گھبراؤ مت بہن۔ میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالوں گا۔"

یہ کہہ کر عبدل وہاں سے چلا گیا۔ اس عورت نے آواز دی۔

"بھائی صاحب چائے تو پی کر جائیے۔"

"نہیں میں چائے کے قابل نہیں ہوں۔ . . . خدا نے چاہا تو ایک دن چائے ضرور پیوں گا۔"

عبدل آگے بڑھا۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا۔ تھوڑی دور جاکر اُس کی ملاقات ایک نوجوان لڑکے سے ہوئی۔ جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ اُس لڑکے نے عبدل کو غور سے دیکھا۔ عبدل جرأت کر کے اُس کے قریب چلا گیا۔ اس سے مخاطب ہونے ہی لگا تھا کہ ایک لڑکی وہاں پر آئی اور اس نوجوان کے پاؤں پڑ گئی۔

"حمید حمید میرے ساتھ ایسا ظلم مت کرو۔" اُس لڑکی نے کہا۔

یہ سُن کر حمید اور غصے میں آگیا۔ حمید نے اُس سے کہا۔

"جاؤ جاؤ جو کرنا ہے کرو۔"

"یہ دھوکا ہے حمید۔"

"اگر یہ دھوکا ہے تو دھوکا ہی رہنے دو۔" یہ کہہ کر حمید وہاں سے چلا گیا۔

اُس کے جاتے ہی وہ لڑکی رونے لگی . . . عبدل اُس کے قریب چلا گیا۔ اور پوچھنے لگا:

"کیا نام ہے تمھارا؟"

"فاطمہ۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"یہ لڑکا کون تھا۔" عبدل نے پھر سوال کیا۔

"اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا اور میری عزّت ..."

"آگے مت کہو میں ساری باتیں سمجھ گیا ہوں۔" اتنے میں حمید وہاں پر آ گیا۔ اور اُس نے آتے ہی کہا۔

"کیا کرے گا یہ بوڑھا یہاں گرد و نواح میں اُگر وادھیلا ہوا ہے۔ اور جہاں اُگر وادھیلا ہوتا ہے وہاں کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔۔" یہ کہہ کر حمید وہاں سے چلا گیا۔ پھر عبدل نے اُس لڑکی کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ یہ "دور صرف برداشت کرنے کے لئے ہے اور وہ بھی یہ سب کچھ برداشت کرلے۔"

"تم پڑھی ہو کچھ۔" عبدل نے پھر اُس سے پوچھا۔

"میں بی اے پاس ہوں۔"

"تو کوئی نوکری کر لو۔" عبدل نے کہا۔

"نوکری کر لوں، اس وقت کشمیر میں موت کا ناچ چل رہا ہے۔ جس دن چار آدمی مریں وہ دن لوگ سمجھتے ہیں کہ امن کا دن تھا۔" ایسے میں عورتوں کی عزّت کا لُٹنا ایک معمولی جرم ہے۔" عبدل نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

"کہاں ہیں وہ لوگ جو عورت کو دیوی مانتے ہیں۔ کیا کشمیر کی عورتیں عورتیں نہیں ہیں۔ کیا ان کی کوئی عزّت نہیں ہے۔" عبدل چیخا پھر تیزی سے دوڑا اور گر گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی اُسے اُٹھانے والا نہیں تھا۔ کوئی اُسے سنبھالنے والا نہیں تھا۔ اُسے خیال آیا کہ اُسے تو خود ہی اُٹھنا ہے خود ہی بیٹھنا ہے۔ وہ کشمیری ہے اُسے دوبارہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا ہے۔

اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ حال کا کشمیر غم سے نظر آیا۔ بڑی بڑی کوٹھیوں والے امیر لوگ لیڈر افسر تو یہاں سے بھاگ گئے تھے۔ ڈل کا پانی صاف کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ جہلم کے بہاؤ میں سستی آگئی تھی۔ کشمیر کے سادہ لوگ یہاں سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے گویا کہہ رہے ہوں "تمہارے بغیر اب ہمارا کوئی بھی نہیں ہے۔"

عبدل ایک بس میں بیٹھا اور جموں آ گیا۔ راستے میں بار بار سپاہیوں نے اُس کی تلاشی لی۔

"ان سپاہیوں کو تلاشی لینے کا کیا حق ہے۔" ایک شخص نے کہا۔

"مجھے تلاشی دینے میں اعتراض کیا ہے۔"

عبدل نے دل میں سوچا ..... "اس چکر سے ہم کب آزاد ہوں گے۔ یہ وہم اور شک کا چکر۔ فوجی تلاشی لیتے ہیں، لوگ ناراض ہوتے ہیں۔ لوگ اعتراض کرتے ہیں، تو فوجی شک کرتے ہیں۔" عبدل کو یاد آیا کہ ۱۹۴۷ء میں شیر کشمیر کے حکم کے مطابق والنٹیئر تلاشی لیا کرتے تھے۔ وہی پہرہ دیا کرتے تھے اور فوج دشمن سے لڑا کرتی تھی۔

عبدل کو جموں بھی بدلا بدلا سا لگا۔ اُسے اس شہر کے گلیاں کوچے بھی عجیب سے لگے۔ ایک ٹیکسی والے کو عبدل نے آواز دی:

"ٹیکسی ٹیکسی۔" آواز سن کر ٹیکسی والا رک گیا۔

"کہاں جانا ہے۔" ٹیکسی والے نے پوچھا۔

"کیا ٹیکسی کا میٹر نہیں چلتا؟" عبدل نے پوچھا۔

"لگتا ہے اس شہر میں نئے ہو۔" ٹیکسی والے نے جواب دیا۔

"ہاں بھائی نیا نہیں مگر اجنبی ضرور ہوں۔۔" عبدل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"تو میں پوچھ رہا تھا کہ کیا یہاں میٹر نہیں چلتا۔"

"یہاں پر صرف ٹریفک پولیس کا میٹر چلتا ہے۔"

"کیا کوئی چیک کرنے والا نہیں ہے۔"

"یہ گورنری راج ہے۔"

یہ سن کر عبدل ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی والے نے ٹیکسی چلانی شروع کر دی۔ عبدل نے چاروں طرف دیکھا۔

"یہ گورنری راج ہے۔" ٹیکسی والے کے ان الفاظ نے ساری بات

ہی ختم کردی۔ عبدُل سمجھ گیا کہ یہ حکومت کیسی ہے اور کیا ہے۔ اُس نے اس کے متعلق زیادہ سوچ کر وقت نہ ضائع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

کچھ دیر کے بعد ٹیکسی والے نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کیمپوں میں یعنی کہ کشمیری کیمپوں میں جانا ہے۔"

"ہاں بھائی ہاں۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔"

"اچھا اچھا کشمیری کیمپوں میں۔۔۔" ٹیکسی والا اشرارت آمیز طریقے سے مُسکرایا۔ عبدُل ساری بات سمجھ گیا۔ اُسے یاد آیا کہ سرحد کے اُس طرف بھی ٹیکسی والے نے کشمیری مہاجروں کے متعلق یہی کہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اُسے مقبول شیروانی یاد آگیا۔ اُسے آزادی کے شہید یاد آگئے۔ تھوڑی دور جا کر ٹیکسی رُک گئی۔

"یہ کشمیریوں کا کیمپ ہے۔" ٹیکسی والے نے عبدُل سے کہا۔

بل ادا کرنے کے بعد عبدُل سیدھا کیمپ کے اندر چلا گیا۔

عبدُل نے دیکھا کہ باہر بچے گندی نالیوں میں کھیل رہے ہیں۔ ایک ایک کمرے کے اندر دس دس اشخاص جانوروں کی طرح پڑے ہوئے ہیں۔ عبدُل نے دیکھا کہ کشمیری عورتوں نے کانوں میں روایتی کانٹے پہنے ہوئے ہیں مگر لگتا تھا کہ کسی روایت کے طور پر نہیں بلکہ سزا کے طور پر پہنے ہوئے ہوں۔ کشمیر کا حُسن گرمی سے گھل رہا تھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ پھول خوشبو سے الگ ہونا چاہتے ہیں۔ بڑے بڑے بزرگوں کی گردنیں ٹیڑھی ہو گئی تھیں کیوں کہ انھیں رات بھر ایک ہی طرف منہ کر کے سونا پڑتا تھا۔ ایک ہی کمرے کو رسوئی اور سونے کے کمرے میں تقسیم کیا گیا تھا۔ رسوئی میں جو جھوٹے برتن پڑے تھے جو ظاہر کر رہے تھے کہ کئی دنوں سے یہاں پانی نہیں آیا ہے۔ عورتوں کے ہونٹ سوکھے ہوئے تھے اور منہ کے اندر چھالے پڑے

ہوئے تھے۔ کیونکہ کھچلا کا انھیں راس نہیں آیا تھا۔ اُن کے جسم بھدے ہو گئے تھے۔ میٹ، کرم اور چاول نہ ملنے کی وجہ سے بڑھے ہو گئے تھے۔ بچوں کے کپڑوں کو پسینہ پونچھنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ باہر گلی سڑی سبزی کی دوکانیں بھی تھیں۔ دیواروں پر ہر پارٹی کا جھنڈا و نشان تھا۔ کسی جگہ یہ بھی لکھا تھا:

"فخر سے کہو ہم ہندو ہیں"۔۔۔ "اگرواد ختم کرو۔۔۔ شیر کشمیر زندہ باد۔"

دُور ایک منچ لگا ہوا تھا۔۔۔ عبدُل نے محسوس کیا۔ کیونکہ سیاسی پارٹیوں کے جلسوں میں دوسرے لوگ کم جاتے ہیں اس لئے ہر سیاسی پارٹی کا لیڈر یہیں پر تقریر کرتا ہے پھر اپنے فوٹو کھنچواتا ہے ٹیلی ویژن پر دکھاتا ہے کہ اس نے کتنے بڑے جلسے کو خطاب کیا ہے۔

عبدُل کو شیر کشمیر یاد آئے۔ جنھوں نے ان لوگوں کو بچانے کے لئے جناح کو ٹھکرایا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں خود سپاہی بن کر ان کی حفاظت کی تھی۔

کشمیر کی تاریخ کے یہ ماتمی لفظ تھے جو آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں سے سُکڑے بدنوں پر لکھے گئے تھے۔ گرمی از حد تھی۔ چاروں طرف مکھیاں ہی مکھیاں تھیں۔ کیمپوں کے لئے ایک ایسا گرم علاقہ مخصوص کیا گیا تھا جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ کشمیر کے موسموں اور خوب صورتی کو سزا دی گئی ہے۔

عبدُل پریشان ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو نہ آسکے۔ کیونکہ دھوپ تیز تھی۔ لہٰذا اُسے اس بات کا بھی از حد دُکھ ہوا کہ وہ اپنے دُکھ کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ ڈھونڈھ آوازیں عبدُل نے ایک شخص سے پوچھا:

"کیا نوا کی پورہ کے لوگ اس کیمپ میں نہیں ہیں؟" اُس شخص نے ہاتھ کی اُنگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"وہ جو سامنے ٹینٹ وہاں پر نوا کی پورہ کے لوگ رہتے ہیں۔"

وہ ٹینٹ تقریباً دو سو گز کی دُوری پر موجود تھا۔ عبدل نے تیز چلنے کی کوشش کی مگر ہمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اُسے لگا کہ اُس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس کے پاؤں میں ہی کیوں بیڑیاں تو کشمیر کو پڑی ہوئی ہیں... کشمیر جو دوڑا کرتا تھا، ناچا کرتا تھا وہ بیڑیوں میں قید ہے۔

مشکل سے عبدل اُس کیمپ کے پاس پہنچا جہاں نقل مکانی کرنے والے لوگ رہتے تھے۔ عبدل نے ایک شخص سے پوچھا:

"یہاں بدری رہتا ہے؟"

"یہاں پر کسی کا کوئی نام نہیں ہے۔ ہر آدمی ریفیوجی ہے۔" اُس شخص نے جواب دیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟" عبدل نے کہا۔

"ہاں بھائی ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ نام اُن کا ہوتا ہے جن کا گھر ہوتا ہے۔ ملک ہوتا ہے، ریاست ہوتی ہے۔"

عبدل اُس شخص سے باتوں میں مصروف ہی تھا کہ ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ مگر مزے کی بات تو یہ تھی کہ اب کی بار دھوپ اُس کے آنسو کو سُکھا سکتی تھی۔ وہ عبدل کے گلے لگ کر رونے لگا۔ محسوس ہوا کہ جیسے وہ کشمیر کے گلے لگ کر رو رہا ہے۔

وہ شخص عبدل کے گلے مل ہی رہا تھا کہ نیچے سے ایک سانپ آیا اور اُس نے اُسے ڈس لیا۔ وہ شخص گر پڑا۔ عبدل کو محسوس ہوا کہ کشمیری آپس میں گلے مل رہے تھے کہ اگرواد کے سانپ نے انہیں ڈس لیا اگرواد سانپ کی طرح ہے جو ڈستا ہے اور بھاگ جاتا ہے۔ ہمیشہ پیچھے سے وار کرتا ہے۔

شور مچ گیا — عبدل کو لگا کہ کشمیری کو اگر سانپ ڈس جائے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ اس کی موت ہے۔ لہٰذا کسی نے بھی اُسے ہسپتال لے جانے

کی کوشش نہیں کی۔ سب لوگ دُور سے ہی اُسے دیکھتے رہے۔ ہمدردی جتاتے رہے۔ اس کے حق میں چیختے رہے۔ لوگوں نے پھر اس کے حق میں ایک جلوس بھی نکالا۔ اتنی دیر میں اخبار والے بھی آئے اُنھوں نے تصویریں بھی کھینچیں — عبدل کو لگا کہ کشمیر کو اُگرواد کے سانپ نے ڈسا ہے مگر کوئی آدمی اسے چھونے کو تیار نہیں۔ اس کے حق میں صرف تقریریں ہو رہی ہیں، جلوس نکالے جا رہے ہیں۔

اتنی دیر میں ایک گاڑی آئی۔ ڈرائیور گاڑی سے باہر آیا اور اس نے آتے ہی کہا:

"سُنا ہے ایک کشمیری کو یہاں سانپ نے ڈسا ہے۔" ڈرائیور نے یہ بات عام لہجے میں کہی۔

عبدل کو یاد آیا کہ ایک بار اُس کے گاؤں کے ایک شخص کو بچھو نے چھوا تھا اور ڈاکٹر صرف دس منٹ دیری سے آیا تھا۔ اس واقعے کو گاؤں کا ایک بہت بڑا واقعہ سمجھا گیا تھا۔ دوسرے دن شیخ اور بخشی دوڑتے ہوئے وہاں پر آئے تھے۔

مگر آج وہ ڈرائیور بات ایسے کر رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اور جو ہوا وہ ایک معمولی واقعہ ہو۔

ڈرائیور کی بات سُن کر ایک شخص نے کہا:

"ہاں یہ بات دُرست ہے بھائی۔"

"کہاں ہے وہ کشمیری؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"وہ پڑا ہے۔" ساتھ والے شخص نے جواب دیا۔

عبدُل کو لگا کہ وقت کیسے بدل جاتا ہے۔ نہ ہی کسی آدمی کو اس بات پر اعتراض ہے کہ اُسے کشمیری کیوں کہا جا رہا ہے اور نہ ہی کسی کو اس بات پر دُکھ ہے کہ اُس شخص کو سانپ نے کیوں کاٹا ہے۔

عبدُل سمجھ گیا کہ جب کسی کا گھر نہیں رہتا تو اس کا نام بھی نہیں رہتا۔ جب یہ لوگ کشمیر میں تھے تو ان کے نام تھے، رشتے تھے، اب یہ صرف کشمیری ہیں... جنھیں آپ کسی نام سے بُلا سکتے، یہاں تک کہ ان کو گالی بھی دے سکتے ہیں۔

عبدل کو لگا کہ یہ لوگ ظلم سہنے کے عادی ہو گئے... اُن کا مقدر اب سانپ ہیں۔ دھوپ ہے، گرمی ہے۔ کیوں کہ اب وہ کبھی اُن وادیوں میں لوٹ نہ سکیں گے جہاں پھول کھلتے ہیں اور نہ ہی اُنھیں کوئی بلانے کے لیے آئے گا۔

جب وہ شخص مرگیا تو لوگوں نے اُس شخص کی لاش کو اُٹھا کر میٹا ڈور میں رکھ دیا۔ وہ گاڑی آگے بڑھی۔ پھر دوسری طرف سے ایک اور گاڑی آئی... دوسری گاڑی نے پہلی گاڑی کو روکا اور ڈرائیور نے پوچھا:

"کہاں سے آ رہے ہو؟"

"ایک کشمیری کی لاش اُٹھانے کے لیے گیا تھا۔"

"کیا ہوا اسے۔"

"مرگیا۔" پہلے ڈرائیور نے جواب دیا۔

"کیسے۔" دوسرے نے پوچھا۔

"سانپ نے کاٹا تھا اسے۔"

"سانپ کو کاٹنے کی ضرورت کیا تھی۔ یہ لوگ تو سانپ

کا نام ہی سُن کر مر جاتے ہیں۔"

"اور اُستاد گھر میں سب ٹھیک ہے۔"

"ہاں بھائی۔ تم سُناؤ۔"

یہ دونوں ڈرائیور باتیں کر ہی رہے تھے کہ ٹریفک رُک گیا۔ اتنی دیر میں ایک پولیس والا آیا۔ اُس نے کہا۔ "چلو بھائی۔"

ڈرائیور نے غصّے میں آ کر کہا۔

"کیا کہتے ہو۔"

پولیس والا نظریں چراتے ہوئے اُسے کہنے لگا۔

"یار ہماری عزّت رکھو۔" یہ سُن کر ڈرائیور آگے گاڑی کر کے گیا۔ عبدُل سمجھ گیا کہ پولیس والے کا ڈرائیور سے کیا رشتہ ہے۔ یہی نہیں وہ سارے نظام کے بارے میں سمجھ گیا وہ سمجھ گیا کہ پولیس والوں کا ملزموں سے کیا رشتہ ہے۔ افسروں کا دلالوں سے کیا رشتہ ہے۔ پھر اُسے ٹیکسی ڈرائیور کے وہ لفظ بھی یاد آئے۔

"یہ گورنری راج ہے۔"

عبدُل آگے بڑھا۔ عبدُل نے دوسرے کمپارٹمنٹ میں دیکھا۔ ایک بُوڑھا باپ اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا۔

"بیٹی ابھی تو صبح کے آٹھ بجے ہیں۔"

"بابا کیا کروں تین چھوٹی گاڑیاں بدلتی ہوں تب جا کر دفتر پہنچتی ہوں۔"

"چلو بھگوان کی مرضی۔ یہ بھی تو اسی کے رنگ ہیں کہ پانچ سو روپے تنخواہ اور دو سو روپے میٹا ڈور کا کرایہ۔"

عبدُل نے یہ سب کچھ سُنا اور چُپ رہا وہ کچھ نہ بولا۔ اُسے لگا کہ کشمیر سب کچھ سُن رہا ہے، مگر چُپ ہے۔ اس نے پھر کشمیری پنڈتوں کے اونچے مکانوں کو یاد کیا۔ اُن کے باغوں اور زمینوں کے بارے میں سوچا۔ پھر اُس نے محسوس کیا کہ اُن کے سر سے اس نعرے کا سایہ اُٹھ گیا ہے۔

"شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مُسلم سکھ اتّحاد"
عبدُل نے پھر ایک شخص سے پوچھا:
"تم بدری کو جانتے ہو۔"
"کون بدری ؟"

"وہ نوائی پور کا رہنے والا" عبدُل نے جواب دیا۔
"وہ ٹینٹ نمبر ۱۵ میں رہتا ہے۔" یہ سُن کر عبدُل بھاگا۔ اُسے لگا کہ ہوا اُسے اُڑا کر لے جا رہی ہے۔ پانی کے بہاؤ کی سی روانی ہے اس کی ٹانگوں میں۔ وہ سیدھا ٹینٹ نمبر ۱۵ کے اندر چلا گیا۔

عبدُل نے دیکھا کہ ایک شخص بیٹھا ہے جس کے چہرے پر لاکھوں جھُرّیاں ہیں۔ اور ایک ایک جھُرّی اس کی تباہی کی چادر کو چھُپانے کی کوشش کر رہی ہے.... مگر یہ ایک........ ناکام کوشش ہے........ کیوں کہ حالات کی ہوا اس چادر کو اُڑا کر تباہی کے جسم کو ننگا کر رہی ہے...... اُس شخص کے بال کشمیر کی برف سے زیادہ سفید ہو گئے ہیں...... آنکھیں جیسے دو گڑھے ہوں جن پہ حالات کی لاشیں پڑی ہیں...... عبدُل کو لگا اس شخص کی عمر جیسے آٹھ ہزار برس ہو........ مگر یہ

شخص صرف ۸۰ برس جیا ہو۔
بدری نے عبدُل کی طرف دیکھا اور اُسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا.... مگر پہچان نہ سکا۔ عبدل کو لگا کہ بدری اپنے کشمیر کو پہچاننے کی ایک ناکام کوشش کر رہا ہے۔

"کون ہو تم ؟" بدری نے پوچھا۔
"میں عبدُل ہوں تمھارا عبدُل، تمھارا پڑوسی۔"
"پڑوسی اس کا ہوتا ہے جس کا گھر ہوتا ہے۔ میرا نہ کوئی پڑوسی ہے اور نہ کوئی گھر۔" بدری نے جواب دیا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہو بدری۔ میں تمھارا عبدُل ہوں جو سو گیا تھا۔"
یہ سُن کر بدری کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ عبدل کی طرف دیکھنے لگا... اس کی آنکھوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو زبان نہ کہہ سکی۔ وہ عبدل کے گلے ملا۔ یوں لگا جیسے کاشی اور کعبہ آپس میں مل رہے ہوں۔

"یہ تمھارا بڑا بھائی بدنصیب بدری ہی ہے۔" بدری نے کہا۔
"بھابھی کہاں ہے۔" عبدُل نے پوچھا۔
"وہ اسپتال میں ہے۔" بدری نے جواب دیا۔
"کیا ہوا ہے اُسے ؟" عبدل نے پوچھا۔
"سن سٹروک۔" بدری نے کہا۔

"اللہ رحم کرے۔" عبدُل نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"تو کانتا ؟"
"کانتا ایک فیکٹری میں پانچ سو روپے مہینے پر کام کرتی ہے۔ صبح آٹھ بجے جاتی ہے اور شام کو آٹھ بجے آتی ہے۔"

عبدل نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"بھابی کو دیکھنے آؤ اسپتال چلیں۔"

"ضرور۔" یہ کہہ کر بدری تیار ہوکر اسپتال جانے کی تیاری کرنے لگا۔ وہ اور عبدل اسپتال چلے گئے۔ وہاں بدری نے ایک نرس سے پوچھا:

"یہاں پر صبح ایک عورت داخل کرائی گئی تھی۔"

"وہ جیسے سن سٹروک ہو گیا تھا۔" نرس نے جواب دیا۔

"ہاں ہاں وہی بدنصیب . . ." بدری نے جواب دیا۔

"وہ شاید مر گئی ہے۔" نرس نے عام لہجے میں بات کی۔ اور آگے بڑھ گئی . . .

عبدل کو لگا کہ جیسے کشمیر کی تہذیب مر گئی ہو اور لوگوں کے لئے ایک عام بات ہو۔

بدری نے آگے بڑھ کر پھر اس سے پوچھا۔

"کیا مر گئی ہے؟"

"مجھے لگتا ہے کہ ضرور مر گئی ہے۔ کیوں کہ کشمیری سن سٹروک سے بچتے ہی نہیں۔"

عبدل کو لگا کہ سارے کشمیر کو نفرت کے سورج کی سن سٹروک لگ گئی ہے۔ مگر لوگوں کو معلوم نہیں کہ کشمیر کبھی مر نہیں سکتا۔ وہ زندہ ہے۔ لوگوں کو ایک دن یہ احساس ہو جائے گا کہ کشمیر اس سن سٹروک کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

بدری پھر اس نرس کے پیچھے بھاگا۔ "آپ ایسا کریں اس کمرے کے اندر چلے جائیں۔" نرس نے عبدل کو لاشوں والے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عبدل اور بدری لاشوں کے کمرے کے اندر چلے گئے۔ وہاں پر کافی لاشیں پڑی تھیں۔ بدری ایک لاش کے سرہانے کھڑا ہو کر رونے لگا۔

"عبدل عبدل یہی تمہاری بھابھی کی لاش ہے۔" عبدل اور بدری بچوں

کی طرح رونے لگے۔

"عبدل یہی تمہاری بھابھی کی لاش ہے۔" وہ دونوں زار زار رونے لگے۔

ایک ڈاکٹر نے دوسرے سے پوچھا۔

"ان کشمیریوں کو کیا ہو گیا ہے۔"

"کوئی کشمیرن سن سٹروک سے مر گئی ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"آج کتنے کشمیری سن سٹروک سے مرے ہیں۔" پہلے ڈاکٹر نے پھر دوسرے سے پوچھا۔ "دس۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"اور سانپوں کے کاٹنے سے۔" "پانچ۔" یہ سن کر عبدل چیخا اور کہنے لگا:

"مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔" عبدل بدری کو وہیں پر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ سیدھا ایک وکیل کے دفتر میں چلا گیا۔ عبدل کو دیکھتے ہی وکیل نے اس کا سواگت کیا۔

عبدل نے کہا۔ "میرا نام عبدل ہے اور میں نے جنگِ آزادی میں کافی کام کیا ہے۔"

"بہت اچھا۔ مگر آپ یہ بتائیے جسے آپ چھڑانے کے لئے آئے ہیں وہ کس جرم میں گرفتار ہے۔"

"نہیں صاحب وہ بات نہیں ہے میں تو آپ کو یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ کچھ کرنا چاہیے کیوں کہ کشمیر جل رہا ہے اور وکیلوں نے ہمیشہ ملک کی خدمت کی ہے۔"

"کل میرے ہائی کورٹ میں مقدمے لگے ہوئے ہیں۔" عبدل یہ سن کر کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ پھر اس نے ایک اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا:

"آخر الیکشن ہو ہی گیا۔"

"روپیہ بھی خرچ ہوا۔"

"لوگ بھی اب مر رہے ہیں۔"

"تم انسانی حقوق کے علمبردار لوگ اسے سیکورٹی فورسز کی زیادتی ہی کہو گے۔"

"آج کل یہ کام بہت اچھا ہے۔ پیسہ بھی خوب ملتا ہے۔ اور مشہوری بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔"

عبدل یہ سب کچھ سُن کر کسی دوسرے کو ملے بغیر ہی جیل پہنچ گیا۔

اس کی چال سے یہ لگتا تھا کہ اس کی داد وہاں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ شیرِ کشمیر تو گہری نیند سو چکے تھے۔ عبدل نے شہر میں فلمی پوسٹر دیکھے۔ اشتہاروں میں لڑکیوں کے ننگے بدن دیکھے۔ سیاسی پارٹیوں کے نعرے پڑھے۔ مگر یہ تو نوہ اسے کہیں دیکھنے کو نہ ملا۔

"شیرِ کشمیر کا کیا ارشاد ہندو مسلم سکھ اتحاد۔"

عبدل جیل کے اندر چلا گیا اور سیدھے جیلر کے کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی جیلر نے کہا:

"بیٹھیے۔" عبدل وہاں پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں ایک حوالدار کمرے کے اندر آیا۔ اور اس نے آتے ہی زور سے کہا۔

"غضب ہو گیا۔"

"کیا ہوا کچھ بولو تو سہی۔" جیلر نے کہا۔

"کیا ہونا تھا۔ وہ لوگ سُرنگ نکال رہے ہیں۔"

یہ سُن کر جیلر تیزی سے دوڑا اور عبدل بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چونکہ عبدل ظاہر کر رہا تھا کہ وہ جیلر کے ساتھ ہے۔ اسی لیے کسی نے بھی اُسے روکا نہیں۔

جیلر نے دیکھا کہ زمین پر ایک جگہ سوراخ ہے۔ اسی بات سے اُس نے اندازہ کر لیا کہ یہیں سُرنگ ہے۔

عبدل نے محسوس کیا کہ کشمیر کے دل پر ایک سوراخ ہے اور اس کے

اندر ایک سُرنگ ہے جس میں کشمیریت بند ہے۔ جیلر اس سُرنگ کے اندر چلا گیا اور کچھ ہی دیر کے بعد ایک نوجوان کو پکڑ کر باہر لایا۔ جیلر نے اس نوجوان کو اس بکرے کی طرح پکڑا ہوا تھا جسے کچھ ہی لمحوں بعد ذبح کیا جانا ہوتا ہے۔

عبدل نے سوچا کہ شیرِ کشمیر تو ان نوجوانوں کو آسمان کی بلندیوں پر اُڑتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

پھر جیلر نے اُس نوجوان کو مارا مگر وہ چُپ رہا۔ اُس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ وہ تو مار کھانے کے لئے ہی پیدا ہوا ہے۔

پھر جیلر نے اُس سے پوچھا:

"کیا نام ہے تمھارا۔"

"رشید۔" نوجوان نے مار کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو۔"

"نوائی پورہ کا۔" پھر وہ اُسے مارنے لگا۔ نوجوان چُپ چاپ مار کھاتا ہی گیا۔ عبدل سمجھ گیا کہ رشید سلیمان کا پوتا ہے۔ پھر اس نے اپنے آپ سے کہا:

"کشمیر کی صرف اتنی ہی کہانی ہے کہ رشید اور اکبر دو بھائی ہیں۔ ایک سُرنگ نکال کر سرحد کے اس طرف آنا چاہتا ہے اور دوسرا سُرنگ نکال کر سرحد کے اُس طرف جانا چاہتا ہے۔"

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔" جیلر نے عبدل سے پوچھا:

"نہیں جناب! اب مجھے اجازت دیجیے۔" عبدل نے کہا۔

"اچھا اچھا۔" جیلر نے غصّے سے کہا۔ یہ سُن کر عبدل وہاں سے چلا گیا۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد عبدل کو اپنے آپ سے باتیں کرنے کی عادت

ہوگئی۔ وہ چلتا اور باتیں کرتا، عبدل جیل سے بس اڈے کی طرف روانہ ہوگیا۔

"سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگرواد غیر ملکی لوگوں نے پیدا کیا ہے۔ مگر دفتروں میں کیوں رشوت دیے بغیر لوگوں کا کام نہیں ہوتا؟"

"کیا کہا آپ نے!" ساتھ والے شخص نے عبدل سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں... کچھ بھی نہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔" یہ کہہ کر عبدل آگے بڑھ گیا اور سیدھا بس اسٹینڈ پر چلا گیا۔ یہاں پر قطار میں کھڑے ہو کر بس کی ٹکٹ لینے لگا۔ عبدل نے دیکھا کہ بس اسٹینڈ پر ہزاروں کشمیری مسلمان اپنی بہو بیٹیوں کو لے کر آسمان کے کھلے چھت کے نیچے پڑے ہیں۔ عبدل کو لگا جیسے وہ حج نہ رہے ہوں بلکہ جرم کر رہے ہوں۔ عورتیں اپنی عصمت کے بوجھ کے تلے دبی ہوئی تھیں۔ سڑکیں آواز دے رہی تھیں کہ لڑکیاں کہہ رہی ہیں:

"ہمیں پیدا ہی کیوں کیا گیا ہے ہائے اللہ!" ان کے چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں سامنے والے پہاڑ پر تھیں اور اس سے یوں مخاطب تھیں:

"اے ویشنو ماں ہماری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تو بھی عورت ہے۔ عورت ہندو یا مسلمان ہو سکتی ہے مگر اس کی عزت صرف عزت ہے۔ وہ نہ ہندو ہے اور نہ مسلمان ہے..." عبدل نے ان کشمیریوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ تو گنتی میں ہی نہیں ہے۔ ان کا خیال کون کرے گا۔"

"ارے یہ شخص اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔"

عبدل چپ رہا

"میرے خیال میں پاگل ہے۔" دوسرے شخص نے کہا۔

"اگر پاگل نہیں ہے تو ہو جائے گا۔" تیسرے شخص نے کہا

عبدل نے سری نگر جانے کے لیے ٹکٹ خریدی اور پھر ایک سرائے

کے اندر لیٹ گیا اپنے آپ سے گویا ہوا... "شاعر نظمیں کیوں نہیں لکھتے تاکہ اگرواد ختم ہو۔ کہانی کار کا قلم خاموش کیوں ہے۔ مصور کے برش کی سیاہی کیوں ختم ہوگئی ہے۔"

"بوڑھے چپ رہ۔" ایک نوجوان نے اس سے کہا۔ اور ریڈیو پر یہ گانا سننے لگا۔"

"چنری کے نیچے کیا ہے چنری کے نیچے..."

یہ سنتے ہی عبدل سو نہ سکا۔ مگر تھکاوٹ کی وجہ سے بے ہوش ضرور ہوگیا۔

صبح اٹھا، گاڑی میں بیٹھ کر سری نگر جانے لگا۔ گاڑی چلنے لگی۔ اس نے پھر کھڑکی سے کیمپ دیکھے اور سوچنے لگا سیکورٹی کونسل کے اندر تقریریں کرنے یا بڑے بڑے ملکوں کے سربراہوں کو سمجھانے کے بجائے کشمیر کے عام لوگوں کو کیوں نہیں سمجھایا جاتا چونکہ گاڑی تیز تھی اور اس کی آواز کافی بھاری تھی۔ لہٰذا کوئی بھی شخص اس کی بات نہ سمجھ سکا۔

گاڑی اور آگے بڑھی، پھر فوجیوں نے روکا اور لوگوں کی تلاشی لی۔ لوگوں نے اس بات کا بہت برا منایا۔

"کاش یہاں کے لیڈر خود گاڑیوں میں سفر کرتے اور خود تلاشی لیتے۔ تاکہ نہ فوجی یہ کام کرتے اور نہ لوگ ناراض ہوتے۔"

"بوڑھا پاگل ہوگیا ہے۔" ساتھ والے شخص نے کہا۔

شام ہوگئی۔ گاڑی سری نگر کے بس اڈے پر رکی۔ لوگ بس سے باہر آئے۔ عبدل بھی باہر آیا۔ سری نگر میں ہڑتال تھی۔ بازار بند تھے۔

"جتنے مرضی بند کرو۔ ہڑتالیں کرو۔ مگر یہ مت بھولو کہ اب عبداللہ زندہ نہیں ہے جو نہرو کو بلا کر لائے گا۔" عبدل نے کہا پھر آگے بڑھا۔

"یہاں کوئی آنے والا نہیں۔ گاندھی مر گیا ہے۔" یہ کہہ کر عبدل پھر آگے بڑھا۔

ایک گاڑی میں بیٹھا اور اپنے گاؤں چلا گیا۔

وہاں پہنچتے ہی عبدل نے دیکھا کہ چاروں طرف خاموشی ہے۔ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ عبدل نے اُن کی طرف دیکھا اور پھر اپنے آپ سے کہا:

"لیڈر کی خصوصیت ہے لوگوں کی رہنمائی کرنا۔ لوگ مر رہے ہیں اور لیڈر کشمیر چھوڑ کر ادھر چلے گئے ہیں۔"

اتنی دیر میں اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ . . "تین دنوں سے بادلوں نے سورج کو چھپا کر رکھا ہے۔"

ایک شخص نے کہا۔

"اتنا زیادہ اندھیرا ہو گیا ہے کہ اب دن اور رات کا پتہ نہیں لگتا۔"

دوسرے شخص نے کہا اور پھر عبدل کی طرف دیکھنے لگا۔

"اب چاند کے نظر آنے کی کوئی اُمید نہیں۔"

چوتھے شخص نے عاجزی سے کہا۔

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم عید کیسے منائیں گے۔"

پہلے شخص نے پھر کہا۔

آسمان پر اندھیرا اور سیاہ ہو گیا۔ یوں لگا کہ یہ ہر ممکن چاند کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز اور ڈراؤنی ہو گئی۔ لوگوں کی پریشانی بڑھ گئی۔ انھیں شک ہوا کہ ضرور ان پر کوئی قہر نازل ہو گا۔ کیوں کہ روشنی رُوٹھ گئی ہے۔ چاندنی رُوٹھ گئی ہے۔ لوگ زور سے رونے لگے۔

اُنھوں زور سے اُوپر دیکھتے ہوئے کہا . . . . گویا آسمان سے پوچھ رہے ہوں۔

"ہم عید کیسے منائیں۔"

مگر آسمان سے کوئی جواب نہیں آیا۔

اُنھیں آسمان کے ہونے پر بھی شبہ ہونے لگا۔ وہ اور پریشان ہو گئے۔

عبدل نے اپنی زبان کھولی اور لوگوں کو اپنے پاس بُلایا۔ لوگ عبدل کے ارد گرد اکھٹے ہو گئے۔

"سنو اچھی طرح سُن لو ایک بار پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔"

"کب؟" ایک شخص نے عبدل سے پوچھا۔

"پچاس برس پہلے کی بات ہے۔" عبدل نے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا؟" دوسرے شخص نے پوچھا۔

"گاؤں کے تمام لوگ اکھٹے ہو کر بدری کے باپ کے پاس گئے تھے۔"

"وہ کیوں؟"

"وہ اس لیے کہ عید سے تین دن پہلے ہی بدری کا باپ جنتری نکال کر بتایا کرتا تھا کہ چاند کب نکلے گا۔ اور چاند اسی روز نکلتا تھا۔"

"اچھا۔" ایک نو عمر بچے نے بے صبری سے کہا۔

"مگر چاند نکلنے کی رات تو بدری بھی پہلے ہی بتا دیا کرتا تھا۔"

"یہاں کے حلوائی تو مٹھائیاں اُس سے پوچھ کر بنانا شروع کیا کرتے تھے۔"

"چاچا، تم پچاس برس پہلے کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں ہاں تو میں کہہ رہا تھا" ——— عبدل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"جب بادل بہت چھا گئے اور کئی دن تک چاند نکلنے کی اُمید ختم ہو گئی۔"

"پھر کیا ہوا؟" دوسرے شخص نے عبدل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"پھر بدری کے باپ نے جنتری سے بتایا تھا کہ چاند نے کس روز نکلنا ہے۔"
عبدل نے کہا۔

"پھر سب لوگوں نے عید منائی تھی۔"
یہ سُن کر لوگوں نے آپس میں کانا پھوسی شروع کر دی۔
"ایک بات اور کہوں؟" عبدل نے پوچھا۔
"کہو۔" لوگوں نے جواب دیا۔
"آؤ بدری کو لے آئیں۔"

"بدری کے بغیر عید ویسے بھی پھیکی ہی ہے۔ کیونکہ تم سب لوگ تو عید مناؤ گے۔ پھر دعوت کسے دو گے۔ عید کی خوشیاں مناؤ گے ضرور مگر یہ خوشیاں دکھاؤ گے کسے۔"
لوگ حیرانی سے عبدل کی طرف دیکھنے لگے۔ بات جاری رکھتے ہوئے عبدل نے کہا۔

"بدری اگر یہاں نہیں ہے تو عید کی اہمیت کسے بتاؤ گے۔ تمھارے روزوں کا احترام کون کرے گا۔"
"مگر بدری چلا گیا ہے۔" ایک شخص نے کہا۔
"گیا نہیں بلکہ بھاگ گیا ہے۔"
دوسرے شخص نے کہا۔
"مگر ہم نے اُسے روکا کیوں نہیں؟" ہم بدری کے بغیر مکمل نہیں ہیں اور نہ ہی ہمارے آباؤ اجداد مکمل تھے۔"
"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے بدری کو جانے کیوں دیا۔"
"کیونکہ تم سچے مسلمان نہیں رہے۔" عبدل نے کہا۔
"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بدری نے ہمارا کیا بگاڑا تھا"... چوتھے شخص نے کہا۔
"اُس کی پوجا ہماری نماز کو مضبوط کرتی تھی۔ اُس کے برت ہمارے

روزوں کی شان تھے۔"
دوسرے شخص نے عبدل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اور وہ جوں ہی شنکھ بجاتا تھا ہمیں معلوم ہو جاتا تھا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"
لوگوں نے پھر کانا پھوسی کی۔
"آؤ بدری کو لے آئیں۔" عبدل نے کہا۔
"وہ بھی اگلی عید سے پہلے۔" لوگوں نے بلند آواز میں جواب دیا۔

کشمیر کتاب گھر
ریذیڈنسی روڈ، جموں (توی)

روزوں کی شان تھے۔"

دوسرے شخص نے عبدل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور وہ جوں ہی شنکھ بجاتا تھا ہمیں معلوم ہو جاتا تھا کہ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"

لوگوں نے پھر کانا پھوسی کی۔

"آؤ بدری کو لے آئیں۔" عبدل نے کہا۔

"وہ بھی اگلی عید سے پہلے۔" لوگوں نے بلند آواز میں جواب دیا۔